نخلستانِ ادب

اقبال نمبر

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد　　　چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد

صادق ایجرٹن کالج بہاول پور

اقبال نمبر

نخلستانِ ادب

صادق ایجرٹن کالج بہاولپور

کا

علمی رسالہ

ڈائریکٹر:- پروفیسر مولوی حافظ سیّد صادق علی صاحب- ایم-اے، ایم-او-ایل

ایڈیٹر:- علی محمد ڈہر بی-اے سٹوڈنٹ

سنہ ۱۹۴۱ء

نخلستان ادب
اقبال نمبر
سنہ ۱۹۶۱ء

نمبر شمار	مضمون	اثر خامہ	نمبر صفحہ

قصیدہ مدحیہ دعائیہ

بتقریبِ خطاب جلالت مآب و عنوان صولت نشان بہ حضور تاجدار فلک دربار الحاج سر صادق محمد خان خامس عباسی بالقابہ العالیہ و خطابات المتعالیہ بادشاہ ملک خداداد بہاولپور خلد اللہ ملکہ و اقبالہ الیٰ یوم النشور۔ از کہترین بندگان حضور سرکار دولتمدار بندہ احقر حاجی احمد حفظہ اللہ من شر حاسد اذا حسد بموقعہ جشن خطاب شوکت انتساب در صادق ایجرٹن کالج بہاولپور

قطعہ

ز ہر سو آمدہ پیک تبارک[1]　　　خطاب جی۔سی۔ایس! آئی مبارک

بنام شاہ صادق خان خامس　　　نیاز دایں خطاب "اللہ بارک"

سر احباب زیں عنواں بلند است　　　سر اعدا تہ تیغ و پلارک[2]

خداوندا بدیں عنوان زیبا　　　ہمیشہ تاج تو بادا بہ تارک[3]

رعیت باد در ظلِ تو خرم　　　تو در ظلِ خداوند تبارک[4]

برائے حفظ جانت حاجی آورد　　　مرصع حرز از دُرِ تبارک[5]

دعائی میکنم بہر تو شاہا　　　اَدامَ اللہُ فِی حِصنِ دیارک

---

[1] تبارک اللہ گویاں ۔ [2] شمشیر جوہردار ۔ [3] تارک فرق و سر ۔
[4] تبارک و تعالیٰ ۔ [5] سورہ ملک ۔

بتقریبِ خطاب عالیہ ریاست بھر میں تین یوم کی تعطیلات جشن شاہانہ منانے کے لئے عطا ہوئیں۔ ان دنوں بالخصوص شہر بہاولپور میں جلسوں وغیرہ سے خوب رونق اور چہل پہل رہی۔ تمام سرکاری عمارات پر جھنڈے لہرائے گئے۔

۲۴۔جنوری ۱۹۴۱ء کو کالج میں جلسہ ہوا۔ جناب محترم پرنسپل صاحب نے اس شاندار خطاب کی اہمیت واضح طور پر بیان فرمائی اور بتایا کہ خطاب جی۔سی۔ایس۔آئی بہت بڑا خطاب ہے جو اکثر معمر حکمرانوں کو بڑی مالی و جانی خدمات کے بعد سرکار انگریزی مرحمت فرماتی ہے۔ یہ ہمارے فرمانروائے عباسی خلد اللہ ملکہٗ کی قابل قدر خدمات کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ حکومت برطانیہ نے ہمارے اعلیحضرت دام اقبالہٗ و ملکہٗ کو اس کم عمری میں ایسے اعلیٰ خطاب سے سرفراز فرمایا۔ تقریر کے بعد قرارداد مبارکباد متفقہ طور پر پاس ہوئی جو اعلیحضرت ظلِ سبحانی کی خدمت میں بھیجی گئی۔ مدحیہ قصیدے بھی پڑھے گئے جناب پروفیسر مولوی حاجی احمد صاحب کا قصیدہ دعائیہ بے حد قابلِ تعریف تھا آپ کی قادر الکلامی مسلمہ ہے ______ آپ کا اور صاحب موصوف کا قصیدہ بتقریب عطائے خطاب شکوہ درج نخلستان ہے۔ آخر میں شیرینی تقسیم ہونے کے بعد جناب الحاج مولوی محمد شاکر صاحب پروفیسر عربی نہایت خلوص دلی سے فتح و نصرت برطانیہ و اعلحضرت سرکار عالی دام اقبالہٗ و ملکہٗ کی درازیٔ عمر و افزونیٔ اقبال کے لئے دست بدعا ہوئے۔ اور اساتذہ کرام و طلباء نے قبلہ مولوی صاحب موصوف کے ہر فقرہ دعائیہ پر بار بار "آمین ثم آمین" کہا۔

اسی یوم مبارک یعنی جمعہ کو اعلیحضرت خلد اللہ ملکہٗ و اقبالہٗ نے جدید جامع مسجد میں اپنی عزیز رعایا کے ساتھ فریضۂ نماز ادا فرمایا اور اقبال مرحوم کے شعر ذیل پر عمل ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بعد نماز جمعہ دعائیں مانگی گئیں کہ رب ذوالجلال برطانیہ عظمیٰ کو موجودہ جنگ میں کامیاب فرمائے۔

۲۵۔جنوری ۱۹۴۱ء کی شام کو چراغ بندی ہوئی۔ عمارات کالج اور ہوسٹلوں کے در و دیوار پر رنگ برنگی جھنڈیاں اور روشن چراغ عجب بہار دکھا رہے تھے۔ غرضیکہ کالج اور ہوسٹلز کی چراغ بندی کا نظارہ قابل دید تھا۔ اور بیساختہ زباں سے نکلتا تھا ؏

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

شہر بہاولپور بھی بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ تماشائیوں کی بھیڑ اس قدر تھی کہ بازاروں اور گلیوں میں چپہ بھر زمین بھی خالی نظر نہ آتی تھی۔ ٹھیک ½ ۷ بجے شام بڑے تزک و احتشام سے جلوس شاہانہ کا گذر ہوا۔ اور کونہ کونہ سے "تاجدارِ عباسی "زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے اس موقع پر جناب چودھری رحمت اللہ صاحب انسٹرکٹر انجینیرنگ کلاس اور ان کے طلبا نے عمارات کالج و ہوسٹل کے آراستہ و پیراستہ کرنے میں جو خدمات سرانجام دیں۔ ہم اُن کے بہت ممنون ہیں۔

۲۶۔ جنوری ۱۹۴۱ء کو اسی جشنِ مبارک کے سلسلہ میں کالج گراؤنڈ میں مختلف کھیلیں، اور دوڑیں ہوئیں کھیلوں کا منظر بیحد جاذبِ قلب و نگاہ تھا۔ مسٹر محمد امین خان لغاری متعلم ایف اے مجموعاً تمام کھیلوں میں اوّل نمبر رہے اور مسٹر بہال سنگھ متعلم بی۔ اے۔ دوم۔

بعد دوپہر سکاوٹ کی پریڈ ہوئی۔ اور ہوائی حملوں کے بچاؤ کے طریقے دکھائے گئے۔ فوج نے بھی اپنے ہنر و فن دکھائے۔ نیزہ بازی۔ رسہ کشی وغیرہ ہوئی۔ جن سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ اور ان کے کرتبوں کی خوب داد دی۔ اعلیٰ مرتبت عزت نشان عماد الملک رئیس الوزرا خان بہادر نبی بخش محمد حسین خان صاحب بہادر ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ سی آئی ای بی ۱۰ او۔ سی۔ ایس۔ آر۔ ے۔ آئی۔ و دیگر وزراء محترم کی تشریف آوری نے جلسہ کی رونق کو دوبالا فرمایا۔ اور آخیر میں بایمائے اعلیٰ مرتبت مدبرِ سلطنت عالیجناب وزیر اعظم صاحب، محترمہ لیڈی صاحبۂ عالی مرتبت ایف۔ اینڈرسن صاحب سی۔ ایس۔ آئی + سی۔ آئی۔ ای۔ ریونیو منسٹر نے انعامات تقسیم فرمائے۔

ہمارے دورِ ادارت کا یہ پہلا کام اور کارنامہ ہے۔ جو "اقبال نمبر" کے نام کے ساتھ موسوم ہے۔ اگرچہ سابق محترم ایڈیٹروں نے اپنے زمانۂ ادارت میں "اقبال نمبر" شائع کرنے کی سر توڑ کوشش کی۔ لیکن۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

افسوس کہ انہیں اپنے عزائم میں کامیابی نہ ہوئی۔ ہم حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا یہ مقولہ ان کے غور و فکر کے لئے پیش کرتے ہیں۔ عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ ہمیں فخر

ہے۔ کہ جنہوں نے کبھی "اقبال نمبر" شائع کرنے کا سنہری خواب دیکھا تھا۔ اس خواب کی تعبیر آج ہمارے ہاتھوں عملی صورت میں آپ کی خدمت میں پیش ہو رہی ہے۔

علامہ اقبال محتاجِ تعریف و تعارف نہیں بھلا کون آپ کے اسم گرامی سے ناواقف ہوگا

بقول ظفر صاحب قریشی دہلوی "اقبال مشرق کا پیامبر اقبال

اسلام کا شاعر اقبال دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہے۔

ٹینی سن ۔ وہ ملکی عصبیت کا علمبردار انگریز کے دل میں انگلیسی جذبے کی لہر پیدا کرتا ہے وہ انگلینڈ کا شاعر ہے ......

براؤننگ ۔ وہ آرٹ کا سچا ترجمان، شعر کی دلہن کو حسن کی اُن اداؤں سے رنگین کرتا ہے۔ جن کی پرستش زبان و مکان کی قید سے بالاتر ہے اور وہ سخن کی محفل میں آرٹ کا صحیح نمائندہ،

ورڈسورتھ۔ وہ نیچر کا شیدائی، فطرت کی زبان میں اپنے القائے تصور کے بھید کھولتا ہے۔ اور وہ ان فضاؤں کا سب سے زیادہ رنگین طائر ہے۔

کیٹس ۔ حسن کی تعریف میں حسین نغمے گانے والا کیٹس، خیال کے پردے پر حسن کی وہ جمال آگین تصویریں اُتارتا ہے۔ جن کی آب و تاب سے خاکی سینے میں دھک دھک کرنے والے دل کی گہرائیاں منور ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہ سچا حسن پرست ہے۔

بائرن ۔ وہ بائرن جس کے جام دل میں حوادث کی آتش سیال بڑی موجیں لیتی ہے وہ جہانِ شعر کا نپولینِ اعظم، وہ انقلابات کائنات کے تذکروں سے شعر کی دنیا میں ہلچل ڈال دینے والا۔ وہ سچا حریت پسند ہے۔

سکاٹ ۔ وہ انگلستان کی شجاعتِ کہنہ کا تصور، شورش کی پرہیبت تصویریں، دماغ کے صفحے پر مرتسم کر دیتا ہے۔ وہ جنگ و جدل کی دنیاؤں کا سب سے بڑا نظر باز ہے

ملٹن ۔ پارلیمان کے شیدائیوں پر طعن کرنے کا ملٹن، فردوس کی گم شدگی و بازگشتگی کا داستان گو مارس کی شوکت، اس کا وقار مسلم ہے۔

شیکسپیئر ۔ وہ صاحب نظر، صاحب دل ۔ مزاج میں فرو سنجیدگی میں مثال محفلوں کی رنگینیاں اپنی آنکھ کی ڈبیا میں چھپا کر لے آنے والا ۔ بیابانوں کی وحشت اپنے دل کے عمق میں گم کر لینے والا جس کی آنکھ پر عرصۂ جنگ کے صدہا منظر عریاں ہیں ۔ جس کے دل میں انسانی کرب کی چبھن کا نازک سے نازک احساس موجود ہے ۔ شاہوں کی کمزوریوں

سے باخبر غریبوں کی قوت سے خبردار، کائنات کا رازدان، مزاج انسانی کا نبض شناس۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا کردار نگار ہے۔

گیٹے۔ وہ المانوی فلک کا رخشندہ ستارا، اپنے عہد کی حشر آفرین فضا میں فلسفے اور خیال کی شعاعوں سے دل کے کاشانوں کو روشن کرنے والا۔ وہ شیکسپیر کا معصر وہ المانیوں میں زندگی کی لہر دوڑا دینے والا۔ وہ مغرب کا سلامی، یورپ کی ظلمتوں میں وہ ایک تابندہ ستارہ ہے۔ جس میں ہمارا عکس ملتا ہے۔

غالبؔ۔ وہ ہندی عظمت کی راجدھانی یعنی جہان آباد کا نغز گو شاعر، محشرستان دل کے ہنگاموں کو نوکِ زباں پر رقصاں کر دینے والا طلسم زار حیات کو جنتِ نظر اور زندگی کے راگ کو فردوس گوش بنا دینے والا۔ آہ۔ اس کی شیریں کہانیاں، سمجھتے بھی ہو کس دور کی ہیں۔ جب ہماری ہزار سالہ عظمت کے لب پر آخری ہچکی تھی۔ وہ غالبؔ، وہ آرزوؤں کے خون پر دل خون کر لینے والا۔

ٹیگور۔ وہ سکونِ ابدی کا رسیا۔ وحدانیت کے گیت گانے والا جس کا نغمہ دکھ بھری زندگی کے تند پالوں کو لوری دیتا ہے۔ وہ ویدانت کا پرستار ہے۔

شلرؔ۔ وہ منتہائے خیال تک پرواز کر جانے والا۔ وہ جنون کو فرزانگی کہنے والا۔ اس کا شمار ہمیشہ وسعت دل رکھنے والوں میں ہو گا۔

ڈانٹے۔ حسن کی پرستش پر مر مٹنے والا ڈانٹے۔ وہ تصور کی جلو میں آسمانوں کی سیر کرنے والا۔ وہ جس کے جذبۂ عشق نے ایک گمنام عورت کو زندۂ جاوید بنا ڈالا۔ اُس کا تصور بے شک قابلِ عظمت ہے۔

ہومر۔ جہاں شعر کا باوا آدم، فردوس خیال کا پہلا مکین، وہ محاربے کی تصویر کھینچ کر دلوں میں زلزلے ڈال دیتا ہے۔

رومی۔ وہ تعریف سے ماورا صوفی۔ حافظ و خیام مئے ناب کے پرستار، نظامی و فردوسی وہ بزم و رزم کے یکہ تاز، سعدی وہ ایران کا شیخ . . . . مادر ایران کو اپنے فرزندوں پر فخر ہے۔

مگر اسلام . . . . اے دوستو . . . . . اسلام۔ بیک وقت قوم، وطن آرٹ فلسفہ، فطرت، حسن، شجاعت، انقلاب، حریت۔ تصوف سب کچھ ہے

اور ان سب سے بھی فزوں تر ......
اقبالؒ اسی اسلام کا شاعر ہے ...... اسلام ہر شاعری سے بلند ہے ......
اور اسی لئے ......
اقبال دنیا کے سب شاعروں سے بلند۔"

علامہ مرحوم عالمِ اسلامی کے ہمدرد۔ عالی دماغ فلاسفر اور مصلح قوم تھے۔ آپ شمعِ رسالت کے پروانہ۔ دینِ مصطفوی کی ترقی کے دیوانہ بین الاقوامی شہرت کے مالک اور عزت و اقبال کے تاج تھے۔ سچ ہے۔ ہندوستان نے صدیوں انتظار کرنے کے بعد صرف ایک اقبال پیدا کیا۔

ہمیں افسوس ہے کہ "اقبال نمبر" شائع ہونے کی افواہ پھیلتے ہی بعض حضرات کی نکتہ چینیوں نے ہمارے جوش و خروش پر آب سرد کا کام کیا۔ ہمیں بار بار بتایا گیا کہ خاص "اقبال نمبر" شائع کرنے سے نخلستان کے بے لطف (DULL) بن جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن ہمارے فاضل ڈائریکٹر مولانا حافظ سید صادق علی صاحب ایم۔ اے ہماری بروقت امداد کو پہنچے۔ اور ہمیں اپنے ارادہ میں مستقل مزاجی سے مشغول بکار رہنے کی ڈھارس بندھائی۔ یہ ان کی جدوجہد اور سعیِ پیہم کا ہی نتیجہ ہے جس سے ایسا شاندار نمبر آج آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔ اور الحمد للہ ہماری مساعی کا اثر یہ بھی ہوا کہ انگریزی سیکشن والے بھی ہماری تقلید پر مجبور ہوئے۔ حقیقت میں علامہ اقبالؒ کا یہ روحانی فیض ہے۔ کہ آج اردو اور انگریزی کے دونوں سیکشن "اقبال نمبر" کے نام سے منسوب ہیں۔

اگرچہ اقبال پر مضمون نگاری کوئی آسان کام نہیں جب تک کہ صاحب موصوف کی تصانیف پر مکمل عبور نہ ہو۔ کیونکہ ایسے شاعر باکمال پر مضمون لکھنے کے فقط یہی معنی نہیں کہ صرف اُن کی زندگی کے حالات قلمبند کئے جائیں۔ بلکہ اُن کی تصانیف۔ ان کے پیام۔ ان کے فلسفہ وغیرہ پر کما حقہٗ تنقید و تبصرہ ہو۔ اقبال پر ہر زبان میں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ لکھی جا رہی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ اگر تمام دنیا کے مصنف شاعر۔ اور افسانہ نویس ہزاروں کتابیں بھی علامہ مرحوم کی بابت لکھیں تو وہ حق بجانب ہیں۔ کیونکہ اُن کا پیغام ہی ایک عظیم الشان پیغام ہے۔ ہمیں اس "اقبال نمبر" کے پیش کرنے کا فخر ہے۔

برگ سبز است تحفۂ درویش

جس محنت اور جانفشانی سے ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے جذبات اور خیالات کا

اظہار فرمایا ہے۔ بے حد قابل قدر و تعریف ہے۔

حضرت علامۂ عصر عالیجناب مولانا مولوی غلام حسینؒ خان صاحب سابق ہوم منسٹر مدظلہ العالی محتاج تعریف و تعارف نہیں "آفتاب آمد دلیل آفتاب"۔ آپ عربی۔ فارسی اور اردو کے بہترین ادیب و شاعر ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے۔ کہ آپ نے حسب دستور سابق "اقبال نمبر" کے لئے ایک نظم عطا فرمائی ہے۔ جو علامہ اقبال مرحوم کے انتقال پرملال کی جانکاہ خبر سن کر صاحب موصوف نے ۱۸۔ مئی ۱۹۳۸ء کو بمقام ملتان لکھی تھی۔ ہم بے حد شکریہ کے ساتھ اس عطیہ کو زیب گلستان کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔ آپ کو فارسی زبان میں جو مہارت تامہ حاصل ہے وہ اس نظم سے ظاہر ہے۔

۲۸۔ جنوری ۱۹۴۱ء کو ۷ بجے شام زیر صدارت جناب اعلیٰ حضرت پرائم منسٹر صاحب بہادر کالج ہال میں جناب اے۔ ڈبلیو۔ ایم حسین صاحب آئی۔ سی۔ ای سپرنٹنڈنٹ انجینیر ریاست بہاولپور نے بامداد میجک لینٹرن "شمالی ہندوستان میں آبپاشی" کے موضوع پر نہایت ہی عمدہ تقریر فرمائی، معزز یورپین خواتین و دیگر حکام کی شمولیت سے بیحد رونق تھی۔ تمام حاضرین عالمانہ تقریر سے بہت متاثر ہوئے۔ ہم فاضل مقرر کے بہت مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار فرما کر ہماری معلومات میں اضافہ فرمایا۔ آخر میں فاضل محترم صاحب صدر موصوف نے معزز مقرر کی تقریر کی مزید وضاحت فرمائی اور ان کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔

ای آمدنت باعث آبادیٔ ما

اس دفعہ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب معلوم ہوا کہ اعلیٰ مرتبت وزیر صاحب تعلیم ریاست بہاولپور از شفقت آپ پرنسپل صاحب نے فاضل محترم جناب سر عبدالقادر صاحب بار ایٹ لا کو برائے خطبۂ صدارت بر موقعۂ تقریب جلسہ تقسیم اسناد پنجاب یونیورسٹی مدعو فرمایا۔ ہم قبلہ صاحب موصوف کے بے حد ممنون و مشکور ہیں کہ آپ نے دعوت نامہ کو شرف قبولیت بخشا اور یہاں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی۔

آپ کی ذات والا صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ "مخزن" کے ایڈیٹر رہے

ہائیکورٹ کے جج بنے۔ بحیثیت ممبر آف انڈیا کونسل کارہائے نمایاں کئے۔ اس کے علاوہ بھی آپ مختلف عہدوں پر فائز ہوتے۔ آپ عالمِ اسلامی کے مایۂ ناز فرزندِ ملت ہیں اور ادبی دُنیا آپ کی بے نظیر اور بیش بہا خدمات پر نازاں ہے۔ غرضیکہ ہندوستان آپ کی ذاتِ والا صفات پر جتنا فخر و ناز کرے بجا ہے۔

۲۲ر فروری ۱۹۴۱ء کو بروز سنیچر جلسۂ تقسیم اسناد کالج ہال میں منعقد ہوا۔ اعلیٰ مرتبت وزرائے ریاست و دیگر حکام کی شرکت نے رونق کو دوبالا کر دیا۔ بڑا ہال طلبائے کالج اور معززین شہر سے بھرا ہوا تھا۔ ٹھیک ۱۲ بجے دوپہر جناب قبلہ سر عبد القادر صاحب عالی مرتبت وزیرِ تعلیم کالج میں تشریف لائے۔ محترم جناب پرنسپل صاحب نے آپ کا پُرجوش استقبال کیا۔ اور اساتذۂ کرام سے آپ کا تعارف کرایا۔ جونہی آپ معہ وزرائے عظام اور اساتذۂ کرام ہال میں داخل ہوتے۔ حاضرین نے آپ کا تالیوں کی گونج سے خیر مقدم کیا عالی مرتبت میجر محمد شمس الدین صاحب وزیرِ معارف ریاست بہاول پور کرسئی صدارت پر جلوہ افروز ہوئے سب سے پہلے ہمارے محترم پرنسپل صاحب نے کالج کی سالانہ رپورٹ پڑھی۔ اور اپنی رپورٹ میں کالج کی غیر معمولی ترقی کا تذکرہ کیا۔ تقریر ختم ہونے پر صدرِ محترم نے کامیاب طلباء کو سندات تقسیم فرمائیں۔ اور ہر ایک کامیاب طالب علم نے معزز صدر سے مصافحہ کرنے کا فخر حاصل کیا اس کے بعد جناب سر عبد القادر صاحب کی خدمت میں خطبۂ صدارت پڑھنے کے لئے درخواست کی گئی۔ حاضرین آپ کے خطبۂ صدارت سے بے حد محظوظ ہوتے۔ آپ کی فصیح و بلیغ تقریر نے طلباء کے علم میں بے حد اضافہ کیا۔ آپ نے کامیاب طلباء کو مخاطب کر کے فرمایا۔ کہ جس طرح اب آپ صاحب القلم ہوگئے۔ اسی طرح آپ کو صاحب السیف بننے کی ضرورت ہے۔ یعنی انہیں بہادر اور جوانمرد بننے کی ترغیب دی۔ آپ نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہ آپ کا فرضی اور قیاسی دَور (تعلیمی دَور) ختم ہوا۔ اور اب آپ کے عملی دَور کا آغاز ہے، اس دَور میں آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لیکن اگر آپ میں استقلال۔ ہمت جوانمردی اور قابلیت کے جوہر ہیں۔ تو یقیناً آپ کامیاب زندگی بسر کرینگے۔ تقریر کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

بعد از دوپہر قبلہ سر عبد القادر صاحب مدظلہٗ نے ہوسٹلوں کا معائنہ فرمایا اور راقم الحروف کو صاحب موصوف سے بحیثیت مانیٹر صادق دار الاقامہ، بتوسط جناب پرنسپل صاحب

شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ آپ نے ہوسٹل کے اندر صحن میں اُگے ہوئے بیل بوٹوں کو کچھ ذرا وسیع پیمانہ پر لگانے کے لئے مشورہ دیا۔ اور فرمایا کہ بورڈروں کو ترغیب دلائی جائے۔ کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے بیل بوٹے لگایا کریں۔ آپ نے اس سلسلہ میں انگلستان کے رہنے والوں کے متعلق کہا کہ وہ اپنے ہاتھ سے بیل بوٹے لگانے کو بے حد پسند کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک گھر چھوٹا سا باغیچہ ہے۔ اور تمام شہر ایک خوشنما بڑے باغ کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ آپ ہوسٹل کے انتظام اور بالخصوص صفائی سے بہت متاثر ہوئے جناب پرنسپل صاحب کی اور پروفیسر مولوی حاجی احمد صاحب سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل کی حسن کارکردگی پر اظہارِ مسرت فرمایا اور مانیٹر کی خدمات کا اعتراف کیا۔ اس کے بعد لائبریری اور ہوسٹل ہی میں تشریف لے گئے۔ لائبریری کی نمایاں ترقی۔ معیاری رسائل مفید دلچسپ اور نئی کتابوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

اسی روز ساڑھے سات بجے شام کو کالج ہال میں زیر صدارت عالی مرتبت جناب جہتہ اودھوداس صاحب وزیر عدلیہ ریاست بہاولپور، آنریبل سر عبدالقادر صاحب نے "تعلیم نسواں" کے موضوع پر تقریر دلپذیر فرمائی۔ سب سے پہلے مسٹر شبیر حسین صاحب شبیر بخاری (اولڈ بوائے) نے مندرجہ ذیل برجستہ و دلچسپ اشعار فاضل لکچرار کی مدح وثنا میں پڑھ کر خراجِ تحسین حاصل کیا:۔

سر عبدالقادر بالقابہٗ

اصلاحِ وطن پر بخت رسا نازاں ہے سر عبدالقادر کا	افلاکِ صحافت پر نیر تاباں ہے سر عبدالقادر کا
ملتا نہیں ادبی دنیا میں مخزن سا رسالہ ڈھونڈھے سے	گلہائے مضامیں ہیں جس میں داماں ہے سر عبدالقادر کا
اقبال کی بالغ نظری سے جذبات میں ہیجان ہے لیکن	اقبال کے شہکاروں پر بجا احسان ہے سر عبدالقادر کا
شبیر خوشامد اس میں نہیں ہے مغتنم ان کی ذات ہمیں	اخلاص و مروت غمخواری سامان ہے سر عبدالقادر کا

تقریر کے شروع میں آپ نے فرمایا کہ میرے عزیز پرنسپل صاحب نے دو موضوع "تعلیم نسواں" اور "اردو زبان" میری تقریر کے لئے تجویز فرمائے تھے۔ جن میں سے میں نے ایک کو یعنی "تعلیم نسواں" کو منظور کیا تھا۔ لیکن اب میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ "تعلیم نسواں" پر تقریر کرنے سے پہلے میں "اردو زبان" کے متعلق بھی کچھ عرض کروں۔ آپ کی جامع مانع تقریر کا خلاصہ یہ ہے ـــ کہ اردو

اور صرف اردو ہی ایسی زبان ہے جو اس وسیع و عریض ہندوستان کے ہر گوشے اور کونے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور زمانے نے اسی زبان کو ہندوستان کے دفتری زبان بننے کا تمغہ عطا کر دیا ہے۔

اس کے بعد فاضل لکچرار نے "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ" کی اہمیت واضح فرمائی۔ اور تعلیم نسواں کی (جو اس وقت ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مروّج ہے۔) مفصل تاریخ بیان فرمائی۔ اور واضح کیا کہ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد جو نصاب لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مروج ہوا تھا۔ آج ہندوستان کی ترقی نے اس کو ناکارہ ثابت کر دیا ہے۔ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ کہ اب قطعی طور پر لڑکیوں کا نصاب مختلف ہونا چاہیئے۔ کیونکہ دونوں کے مشاغل فطری طور پر جداگانہ ہیں۔ فاضل لکچرار نے اپنی تقریر میں ایسے ایسے نکات بیان کئے جس سے سامعین نہ صرف مسرور بلکہ بے حد متاثر ہوئے۔ اختتام تقریر پر صدر محترم نے مکرم مقرر کی فاضلانہ تقریر کی بے حد مدح سرائی فرمائی۔ اپنی طرف سے اور حاضرین کی طرف سے انتہائی خلوص و محبت کے ساتھ ہدیۂ شکر پیش کیا۔

حسن اتفاق سے اس دفعہ "اقبال نمبر" شائع ہو رہا ہے۔ آپ علامہ اقبال کے گہرے دوست ہیں یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔ کہ جہاں علامہ اقبال مرحوم کی یاد تازہ ہو رہی ہے وہاں علامہ مرحوم کے عزیز و مخلص دوست یعنی سر عبدالقادر صاحب کے کارناموں کا تذکرہ بھی نخلستان کے اوراق کی زیب و زینت بن رہا ہے۔

ہمارے فاضل ڈائریکٹر پروفیسر صادق علی صاحب ایم۔ اے۔ اور مسٹر محمد نواز صاحب شہید ایڈیٹر انگلش سیکشن، جناب سر عبدالقادر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے "پیغام اقبال" کے طالب بنے۔

صاحب موصوف نے فرمایا۔ کہ اقبال کا کلام ایک پیغام ہے اور یہ پیغام عمل کا پیغام ہے۔ اور اس پیغام پر عمل کرنے ہی سے دارین کی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد سر عبدالقادر صاحب نے پروفیسر صادق علی صاحب کے مختلف سوالات کے مدلل اور مکمل جوابات دیئے۔ غرضیکہ ان کی دو اڑھائی گھنٹہ کی دلچسپ گفتگو سے پروفیسر صاحب موصوف اور دیگر حضرات بے حد محظوظ و مستفیض ہوئے۔

---

۲۲ فروری ۱۹۴۲ء کو شام والی تقریر کے بعد کنووکیشن کے اعزاز میں کالج نے ایک مشہور بیکانیری گویّے کو مدعو کیا تھا۔ یہ مطرب دلنواز جس نے اپنے گانے، ناچ اور راگ کے زیر و بم سے سامعین کو بے حد خوش کیا۔ علم موسیقی میں ماہر تھا۔ حاضرین نے اس کے فنی کمالات کی خوب داد دی۔

ہمارے محترم پرنسپل شیخ محمد عبدالمجید صاحب ایم۔ اے ہندوستان میں ان ممتاز ہستیوں میں سے ہیں۔ جنہیں ہمیشہ اپنے نوجوانان کالج کی بہبودی و بہتری کا خیال بے چین رکھتا ہے اپنے عزیز طلباء کی تکالیف و مشکلات کا ازالہ فرما کر کالج اور ہوسٹلوں میں جس قدر آرام اور سہولتیں مہیّا فرمائی ہیں۔ ان کی وجہ سے طلبائے کالج ہمیشہ صاحب موصوف کے ممنون رہینگے ہمیں قوی امید ہے کہ کالج ہٰذا کا کوئی اولڈ بوائے اگر آج ایک بار پھر بغرض سیر و تفریح یہاں آنکلے تو یقیناً کالج کی موجودہ ترقی و عروج کو دیکھ کر دنگ رہ جائیگا۔ اور اپنے تعلیمی زمانہ اور موجودہ زمانہ میں زمین و آسمان کا فرق پائیگا۔ بلکہ بہت حد تک ممکن ہے کہ اس کو موجودہ تعلیمی ترقی۔ رونق اور سجاوٹ کی وجہ سے کالج کی فلک بوس عمارت کے پہچاننے میں تامّل کرنا پڑے۔

موجودہ زمانہ یقیناً دَورِ ترقی ہے۔ ہر فرد۔ ہر سوسائٹی۔ ہر قوم اور ہر ملک ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ ہمارے ہمدرد محترم پرنسپل صاحب نے بھی نہایت دور اندیشی اور دور بینی سے رفتارِ زمانہ کے پیشِ نظر ہماری تکلیفوں کا احساس فرمایا۔ اور کالج ہال کو برقی پنکھوں سے سجادیا۔ اور بجلی کے قمقموں سے بھی آراستہ کردیا۔ ریڈیو کی تفریحی و تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بے حد ضرورت تھی۔ وہ بھی جناب پرنسپل صاحب کی اعانت و عنایت سے مہیا ہوگیا۔ اب دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے طلباء مفید اور دلچسپ علمی تحقیقی۔ مزاحی۔ اخلاقی۔ معاشرتی۔ تاریخی۔ افسانوی۔ سیاسی۔ قومی اور ملکی معلومات سے مستفید ہوتے ہیں اور ہوتے رہینگے۔ نیز آپ تعلیمی معاملات میں جس قدر دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ کی کوششوں اور محنتوں کا معیار یونیورسٹی نتائج سے اظہر من الشمس ہے۔ گذشتہ سال بی اے۔ میں فارسی کا نتیجہ سو فیصدی رہا۔ اس لئے جناب پروفیسر حافظ صادق علی صاحب ایم۔ اے مستحق مبارکباد ہیں۔

بندہ از طاعت بعقبیٰ میرسد　　لیکن از خدمت بمولیٰ میرسد

محترم پرنسپل کے بے شمار محاسن و محامد میں سے جذبۂ خدمت سب سے زیادہ قابل قدر ہے۔ ہوسٹلوں میں طلباء کے بیمار ہوتے ہی آپ کی بیقراری اور پریشانی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ جب تک کہ مریض کی دلجوئی اور عیادت نہ فرمائیں آپ کے لئے گھر میں تسکین کے ساتھ سے بیٹھنا اور سونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ خدا ایسے فرشتہ سیرت انسان کو اس کا صلۂ خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

امسال کالج کی فضا انتخابات کی وجہ سے وقتی طور پر کچھ مکدر ہو گئی اگرچہ انتخابات بذاتِ خود کوئی بری چیز نہیں لیکن افسوس ہے کہ اکثر اوقات ہم خود غرضیوں کا شکار ہو کر ان کے اصلی مقصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انتخابات کے موقعہ پر عموماً مختلف پارٹیاں عالم وجود میں آتی ہیں۔ اور آنی چاہئیں۔ لیکن چاہئے کہ ہار اور جیت کے فوراً ہی بعد تفرقہ بازی معدوم ہو جائے یہی وجہ ہے۔ کہ مہذب سمجھدار اور عقلمند انسان فیصلہ ہوتے ہی باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم لوگ فتح و شکست کے بعد دشمنی و عداوت کا شکار ہو جاتے ہیں اور جب انتخاب کا صحیح مفہوم ذہنوں میں آ جائیگا۔ تو ہمیں امید ہے کہ انتخابات کے ختم ہوتے ہی ہر طرح کی کشمکش بھی ختم ہو جایا کریگی۔

خلافِ معمول اس دفعہ ایڈیٹوریل بورڈ کے انتخابات کے موقعہ پر خوب دوڑ دھوپ رہی۔ ووٹ دہندوں کی خوب قدر و منزلت بڑھی۔ اور عنکبوت کی مانند ووٹ ہنٹرز کی چوکھٹ تک صبح و شام تانا بندھا رہا۔ بڑے زور و شور سے مقابلہ ہوا۔ کیونکہ ہر پارٹی کی جانب سے بااثر۔ بارسوخ اور ہر دلعزیز نمائندے میدانِ عمل میں سرگرم تھے آخر اس قدر تگ و دو کا نتیجہ یہ نکلا ———— کہ ذیل کے حضرات منتخب و کامیاب ہوئے۔

مسٹر محمد نواز صاحب شہید　　ایڈیٹر نخلستانِ ادب (اوسس Oasis) انگریزی سکشن
مسٹر رادھا کشن صاحب مل　　کرانیکل ایڈیٹر نخلستانِ ادب انگریزی سیکشن
مسٹر علی محمد خاں دہڑ　　ایڈیٹر نخلستانِ ادب اردو سیکشن

ایڈیٹوریل بورڈ ان تمام حضرات کا جنھوں نے قیمتی امداد فرمائی تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ نیز کالج کی مختلف سوسائٹیوں کے انتخابات بھی ہوئے جس کی تفصیل

کرانیکل ایڈیٹوریل نوٹس میں ملاحظہ سے گذری گی۔

---

۱۸ نومبر ۱۹۴۲ء کو دن کے وقت کالج ہال میں یونین سوسائٹی کا مناظرہ زیر صدارت جناب پرنسپل صاحب مقرر ہوا۔ مناظرہ کا موضوع یہ تھا کہ " کیا کالجوں میں جسمانی سزا جاری ہونی چاہیئے " اساتذہ و طلباء جمع ہوئے۔ پروفیسر ایف۔ ایم شجاع صاحب منصف اور پروفیسر بینرجی صاحب حَکم تھے۔ طلباء کے علاوہ ہمارے کالج کے دو فاضل پروفیسروں نے بھی حصہ لیا۔ مناظرہ میں موافق و مخالف صاحبان کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

نمبر شمار	موافق	مخالف
۱	جناب پروفیسر مہتہ مرلیدھر صاحب ایم اے	جناب پروفیسر پیرزادہ محمد عبدالرشید صاحب ایم اے
۲	مسٹر عزیز الرحمٰن صاحب عزیز متعلم بی اے	مسٹر محمد نواز صاحب شہید متعلم بی۔اے
۳	مسٹر رادھا کشن صاحب " "	مسٹر کشن چند صاحب " "
۴	مسٹر محمد انور صاحب انور متعلم تھرڈ ایر کلاس	مسٹر واحد بخش صاحب قلندر متعلم تھرڈ ایر کلاس
۵	مسٹر احمد علی صاحب " "	مسٹر غلام قادر صاحب " "

مناظرہ کا افتتاح جناب مہتہ صاحب نے فرمایا۔ اور بہت دیر تک تجویز زیر بحث کی موافقت میں دلائل پیش کرتے رہے آپ کی تقریر نہایت دلچسپ تھی۔ ان کے بعد جناب پیرزادہ صاحب نے تجویز بالا کی مخالفت میں تقریر فرمائی اور عالمانہ دلائل پیش کئے۔ آپ کی تقریر " کوزہ میں دریا " کے مصداق تھی۔ حاضرین نے خوب داد دی۔ اور بار بار تالیوں کے شور و غل سے فضائے ہال گونجتی رہی۔ آخر فاضل مناظر نے دلائل سے ثابت فرمایا کہ مہر و محبت کے ذریعہ تعلیم دینا زیادہ بہتر ہے۔ طلباء نے بھی تجویز بالا کی موافقت و مخالفت میں اپنے دلائل و آرا پیش کئے۔ لیکن افسوس تقریروں کے خاتمہ پر فاضل ججوں نے صرف طلبا کی تقاریر کو پیش نظر رکھتے ہوئے موضوع زیر بحث کی موافقت میں فیصلہ دیا۔ گویا فتح کا سہرا جناب مہتہ صاحب کے سر ہی رہا۔ مناظرہ کے دوسرے روز ہمیں ڈر تھا۔ کہ شاید اس مناظرہ نے ہماری قسمت کا فیصلہ نہ کر دیا ہو اور جناب پرنسپل صاحب کہیں پروفیسر مولٰنا حاجی احمد صاحب کا ڈنڈا اپنی بغل میں نہ دبالئے ہوں لیکن

تب جان میں جان آئی - جب بالکل یقین ہو چکا کہ یہ تو صرف علمی بحث و مباحثہ تھا -

---

ملک نذیر احمد صاحب لائبریرین ہوشیار - قابل اور فرض شناس نوجوان ہیں - آپ نے امپیریل لائبریری (گورنمنٹ آف انڈیا) کلکتہ سے لائبریری سائنس کا ڈپلومہ بھی حاصل کیا ہے - اور ساتھ ہی آپ کو کالج ہذا کے اولڈ بوائے ہونے کا بھی فخر ہے - بایمائے محترم پرنسپل صاحب لائبریرین صاحب نے لائبریری کا چارج لیتے ہی نبض شناس حکیم کی مانند لائبریری کی تمام اندرونی خامیاں معلوم کیں اور اپنی تمام کوششیں لائبریری کی بہتری کے لئے وقف کر دیں ملک صاحب کی یہ مساعی واقعی قابلِ تحسین ہے - الماریاں - کتابیں - رسالے اور اخبارات نہایت موزون اور خاص ترتیب میں ہیں - جس نے لائبریری کی شان کو دوبالا کر دیا ہے - بہت سی نئی کتابوں کا بھی اضافہ ہوا ہے - سچ تو یہ ہے کہ محترم پرنسپل صاحب کے زیرِ ہدایت لائبریری کی کایا ہی پلٹ گئی ہے -

لائبریرین صاحب ہوسٹل بی کے سپرنٹنڈنٹ بھی ہیں - اور ان کے زیرِ نگرانی ہوسٹل کا انتظام بھی قابلِ اطمینان ہے -

---

الحمد للہ کہ ہمارا کالج آج کل ترقی پر ہے - اس کی تفصیل یہ ہے کہ امسال اوورسیرز کلاس کا کالج میں اضافہ ہوا ہے - اعلیٰحضرت ریونیو منسٹر صاحب اور عالی مرتبت وزیر تعلیم صاحب جنہوں نے از راہ دور اندیشی و بیدار مغزی انجینیری کی تعلیم کا اجرا فرمایا ہے مستحق مبارکباد ہیں - یہ ڈیپارٹمنٹ کالج ہی کی عمارت میں ہے - اور جناب پرنسپل صاحب کے ماتحت - اس ڈیپارٹمنٹ کے رکن رکین جناب نثار احمد صاحب (ایس - ڈی - او) کی ذات والاصفات ہے - جو بہت لائق شریف اور ہر دلعزیز نوجوان ہیں -

---

۵ - دسمبر ۱۹۴۲ء کو بزم ادب کا مشاعرہ منعقد ہوا - طرحی مصرع حسب ذیل تھے -

۱ - آئے نہ تم بہار میں بیت گئی بہار بھی

۲ - کس کی بنی ہے عالمِ ناپائدار میں

مشاعرہ ٹھیک ۷½ بجے شام شروع ہوا۔ جناب ڈاکٹر شجاع صاحب منمی ایم۔ اے کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ جناب فاضل پرنسپل صاحب و دیگر اساتذۂ کرام کی تشریف آوری سے مشاعرہ کی رونق اور دوبالا ہوئی۔ کالج و شہر کے شعرائے کرام نے طرحی و غیر طرحی نظمیں پڑھ کر خراجِ تحسین حاصل کیا۔ جن میں ذکا الملک شجاع صاحب منمی صدر۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب شوق۔ جناب مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب حفیظ۔ جناب مولوی عبدالقادر صاحب جوہر۔ مسٹر محمد نواز صاحب شہید۔ مسٹر اختر صاحب ربانی۔ مسٹر جہانگیر خان بیمار۔ اور مسٹر مول نرائن صاحب شرلی۔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شعرائے کرام کی وجد آفرین نظموں نے دہلی اور لکھنؤ کے مشاعروں کی یاد تازہ کردی۔ سخن فہم اور قدردان اصحاب کے لئے سوائے سر دھننے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بعض اچھے اشعار پر ہال میں "واہ۔ واہ" "مکرر۔ مکرر" کی آوازیں گونج اٹھتی تھیں۔ سامعینِ کرام بے حد لطف اندوز ہوئے۔ آخر صاحب صدر کی مختصر تقریر کے بعد مشاعرہ ختم ہوا۔

ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۹ھ میں کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرزمین بہاولپور کو سرفراز کیا۔ کمیشن نے جامعہ عباسیہ۔ صادق ڈین ہائی سکول۔ صادق ایجرٹن کالج۔ صادق اڈوائر ہوسٹل۔ اور صادق دارالاقامہ کا معائنہ فرمایا۔ ہمارے مہربان پرنسپل صاحب کے حسنِ انتظام۔ کالج کی تعلیمی بلند معیاری۔ بورڈروں کی سادہ مگر پُرناز مسرت زندگی پر اظہارِ مسرت فرمایا۔ ہوسٹلوں کی سادگی اور صفائی سے بے حد متاثر ہوئے۔ یہ کمیٹی ہندوستان بھر کے مندرجہ ذیل مایۂ ناز ہستیوں پر مشتمل تھی۔

۱۔ آنریبل مسٹر ایم عزیز الحق صاحب سی۔ آئی۔ ای۔ سپیکر بنگال لیجسلیٹو اسمبلی وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی و سابق وزیر تعلیم بنگال۔

۲۔ حاجی مولوی ابو الحسن صاحب آئی۔ ای۔ ایس (ریٹائرڈ) سابق ڈائرکٹر تعلیم کشمیر۔

کالج میں مداری کا کھیل ہوا۔ "دو آنہ ٹکٹ" تھا۔ اساتذہ و جملہ طلباء سے بڑا ہال بھرا تھا۔ حاضرین مداریوں کے کرتب اور کھیل سے بے حد محظوظ ہوئے۔ ان کے عجیب عجیب کھیلوں

سے یہی یقین ہوتا تھا۔ کہ آیا یہ جادوگر ہیں یا ولی؟ سکھائے اور پڑھائے ہوئے پرندوں نے بھی کام کرایا گیا۔ طوطیوں اور چڑیوں کے ہر نئے کھیل سے ناظرین انگشت بدنداں رہ گئے۔ واقعی مداری ماہرِ فن تھے۔ جن کی شعبدہ بازیوں کا آج تک دلوں پر گہرا اثر ہے۔

۲۳۔ جنوری ۱۹۴۱ء کی شام کو مجیدیہ لٹریری لیگ کا شاندار مشاعرہ زیرِ صدارت جناب پروفیسر شجاع صاحب منتقی ایم۔اے کالج میں منعقد ہوا۔ مشاعرہ کامیاب رہا۔ اور حاضرین نے شعرائے کرام کے کلام کی خوب داد دی۔

طرحی مصرع حسبِ ذیل تھے:۔

مصرع اوّل :۔ یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

مصرع ثانی :۔ جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی — اقبالؔ

گزشتوں اشاعتوں میں ایڈیٹروں کو اکثر اوقات طلبائے کالج کی بے توجہی اور بے پرواہی کا گلہ و شکوہ رہا ہے۔ اور آج ہمیں بھی اپنے سابق ایڈیٹروں کے نقشِ قدم چلنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ یعنی بارِ ادارت سنبھالتے ہی اگرچہ فراہمیٔ مضامین کے لئے کئی بار زبانی اور تحریری آپ حضرات کی توجہ مبذول کرائی گئی لیکن افسوس ہمارے نامہ نگاروں کے کان پر جوں تک بھی نہ رینگی۔ اور طرفہ یہ کہ بہت سے مہربانوں نے بمصداق "سوال گندم جواب چنا" اقبال نمبر کے لئے مضامین بھیجنے کی بجائے عشقیہ افسانوں اور کہانیوں سے بچارے ایڈیٹر کو نوازا۔ الحمدللہ یہ بھی غنیمت کہ ع
نہ ہونے سے کچھ ہونا ہے بہتر۔ کم از کم قلم اٹھانے کی ہمت تو کی۔ مگر یہ بتا دینا فرضِ اولین سمجھتا ہوں۔ کہ جب تک آپ حضرات ایڈیٹر کا ہاتھ نہ بٹائیں گے۔ ایڈیٹر اکیلا نخلستان کو معراجِ ترقی پر نہیں پہنچا سکتا۔ اب آپ کی مرضی پر منحصر ہے خواہ میگزین کی آبیاری کے لئے کمربستہ ہوں یا نہ ہوں مگر یاد رہے نخلستان کی ناکامی کو صرف معمولی نقصان اور صدمہ نہ سمجھئے۔ بلکہ اس کے ساتھ علمی۔ ادبی۔ قومی اور ملکی نقصانات اور ناکامیاں

بھی وابستہ ہیں۔ کیا کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اس کی اشاعت میں کیوں دیر لگ جاتی ہے؟ اس کا جواب صرف آپ کی بے توجہی بے پروائی اور غفلت کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہم بار بار آوازِ دل پکار پکار کر عرض گزار ہوتے رہے کہ میگزین آپ حضرات کی امانت ہے اور اس کا بگاڑنا اور بنانا بھی محض نوجوانانِ کالج پر ہی منحصر ہے۔ اب بھی نخلستان کی قسمت آپ کے ہاتھوں میں ہے کیونکہ

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری　　اقبالؔ

حسب الحکم عالیہ اعلیحضرت والئے ریاست بہاولپور خلد اللہ ملکہ و اقبالہٗ مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۱ء کو بروز اتوار محترم جناب پرنسپل صاحب نے مع جناب پروفیسر مولوی حاجی احمد صاحب سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل ہا و بورڈران ہر دو ہوسٹل مسجد احاطہ کالج میں صبح کی نماز کے بعد حکومت برطانیہ کی فتح و نصرت کے لئے مخلصانہ دعائیں مانگیں۔

نیز کالج کے دیگر مسلم طلبا و اساتذۂ کرام اپنے اپنے محلوں کی مسجدوں میں اور ہندو و سکھ طلبا مندروں اور گوردواروں میں سرکار انگلشیہ کی فتحمندی کے لئے شریک دعا ہوئے۔

آخر میں ہم سب کی یہی دعا ہے کہ رب ذوالجلال برطانیہ عظمٰی اور اس کے حلیفوں کو موجودہ جنگ میں مظفر و کامیاب فرمائے۔ اور نازیت اور فسطائیت کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دے تاکہ دنیا میں امن و امان قائم ہو۔

آہ! سر شاہ محمد سلیمان رح

مدھم سی روشنی تھی چراغِ اُمید میں　　اے بادِ برگ تو نے اُسے بھی بجھا دیا

آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان ایم اے۔ ایل ایل ڈی کے حادثۂ موت کی پریشان کن خبر سے جس قدر صدمہ پہنچا ہے قابلِ بیان نہیں۔ مرحوم کی ذاتِ گرامی ہندوستان کی اُن چند مایہ ناز ہستیوں میں تھی جو عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ آپ بحیثیت ایک ماہرِ تعلیم۔ ایک قانون دان اور ایک سائنسدان کے ہندوستان بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپ علیگڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور فیڈرل کورٹ کے جسٹس تھے۔ حال ہی میں آپ نے مشہور جرمن یہودی سائنسدان آئین سٹائین ( ) کے نظریۂ اضافیت ( ) کو غلط ثابت کر کے ہندوستان کی علمی رفعت و عظمت کو بڑھا دیا ہے۔

واقعی آپ کی موت سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کو ایسا ناقابلِ برداشت نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالٰی مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل۔ آمین

ایڈیٹر "نخلستان"

مرثیۂ علّامۂ اقبال رح

ذیل کا مرثیہ حضرت قبلہ محسن الملک علامۂ عصر عالیجناب مولانا غلام حسین خان صاحب سابق ہوم منسٹر ریاست بہاولپور کی کاوشِ دماغ کا نتیجہ ہے اور بیحد قابل تعریف آپ کا ذکر جمیل شذرات میں کیا گیا ہے (ایڈیٹر)

برفت از ما شبیلے فخرِ رازی ۔ نظیرش نیست در حکماءِ ماضی
غنی بوده ولے با فقرِ راضی ۔ ربوده از همه شعراءِ بازی
دریغا عرفی و رومی زماں رفت ۔ فدائے ملک و ملت پاسباں رفت
بسوزِ دردِ دل اندر جہاں رفت ۔ جدا گشتہ ازیں دنیا بشانِ بے نیازی
ادیبِ بے بدل آں صاحبِ حال ۔ کہ مشہور است در عالم باقبال
خلاصہ قیل و قالش قول و اقوال ۔ کلامش ہست الہامِ حجازی
چنیں فرخندہ فرزندے دگر گیتی نزاید ۔ اگر زاید بزاید لیک مثلش کے نیاید
ہزار ہا سال مے باید کہ مردے در ظہور آید ۔ حقیقت جلوہ گر گردد برنگِ امتیازی
حقائی ہست ایں از سرِّ اسرار ۔ بمیرد ہر کہ آمد اندریں دار
بسے رفتند از صلحاءِ ابرار ۔ نماندہ ہم نماند کس دریں کاخِ مجازی

"ارمغانِ حجاز" کے جواہر ریزے

(از محترم جناب خان بہادر محمد مظہر صاحب تھانوی پولیس کمشنر ریاست بہاولپور)

آج کل "ارمغانِ حجاز" محترم جناب خان بہادر محمد مظہر صاحب پولیس کمشنر ریاست بہاولپور کے زیر مطالعہ ہے۔ آپ نے "ارمغانِ حجاز" کے خزانۂ جواہرات میں سے دو ایک جواہر ریزے ہدیۂ اوسال فرماتے ہیں ؂ کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا۔ اور ان جواہر ریزوں کا تعلق خصوصی موجودہ جنگِ یورپ اور ہندوستان کے مسلمانوں کی بے عملی سے ہے اب فرمائیے کہ اقبال مرحوم کی ولایت میں کیا کلام ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ "شکوہ اس کا کہ آپ کی رائے میں اقبال ہنوز محتاجِ تعارف ہے جو مسلم حکام اس کا کلام سمجھتے ہیں وہ اس کے عاشق ہیں۔ جو نہیں سمجھ سکتے۔ اُن کے لئے تحریص و ترغیب بیکار ہے۔ آج کل "ارمغانِ حجاز" زیر مطالعہ ہے۔ اس میں ایک نظم ہے۔ جس کا عنوان ہے "ابلیس کی مجلس شوریٰ"۔

نظم ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ نظم ادبی حیثیت سے قطع نظر مسلمانوں کے لئے "بہترین درسِ عمل" ہے۔ اس نظم کے دو الہامی شعر سنئیے۔ "ابلیس اپنے مشیروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے"

؂ دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشہ شرق و غرب
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو

اسی کتاب میں سے ایک فارسی کی رباعی اور سن لیجئے۔ اور داد دیتے رہئیے۔

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست — بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش — بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست"

آپ کو اُردو سے جو شغف ہے وہ آپ کی تصنیف "التماس" سے ظاہر ہے عیاں را چہ بیاں۔ شعروں کا انتخاب۔ ایک ادیب کے علمی و تنقیدی مذاق کا صحیح نمونہ ہوتا ہے۔ آپ اپنی سرع سنانا نہیں چاہتے تھے تو ذم ہی سنئیے۔

"شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے"
(غالبؔ)

والسلام از صادق علی،

صدیق رضؓ

(از سید الیاس سیکنڈ ایر کلاس)

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے (اقبالؒ)

قوموں کے اُبھرنے اور بننے کی صرف دو باتیں ہیں۔ ایک جانی قربانی اور دوسرے مالی قربانی جس قوم کے عوام و خواص میں جانی اور مالی قربانیوں کے صفات بہ اتم وجوہ موجود ہوں تو پھر اس کا اُبھرنا یقینی ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام یہودیوں سے بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لئے کہتے ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں۔ کہ حضرت آپ خود جائیے اور اپنے خدا کو بھی لے جائیے۔ آپ دونوں جا کر لڑیئے۔ ہم تو یہاں مزے سے بیٹھے ہوئے نظارۂ جنگ کرتے رہیں گے۔ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (ترجمہ:۔ تم جاؤ اور تمہارا خدا) دونوں جا کر لڑو، ہم یہاں بیٹھتے ہیں) جب کبھی موسیٰ علیہ السلام خدا کی راہ میں یہودیوں سے روپیہ مانگتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا خدا کے پاس کچھ نہیں ہے۔ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (ترجمہ۔ خدا کا ہاتھ تنگ ہے) یہودی اس قدر بگڑ گئے تھے۔ کہ اُن پر خدا کا عتاب ہوا۔ اور اُن کی دنیا میں جو گت ہوئی ہے وہ ظاہر ہے، ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (اور جم گئی اُن پر ذلت اور پستی کہ دوسروں کی نگاہ میں قدر۔ اور خود اُن میں اولوالعزمی نہ رہی) اُن کے مقابلے میں قرنِ اولیٰ کے مسلمان مابہ الامتیاز نظر آتے ہیں۔ ہر چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ خواہ مال و زر ہو۔ ان کے قوائے جسمانی و ذہنی ہوں، خواہ اُن کی جان ہو وہ سب کچھ حق و حریت کے لئے قربان کر دیتے ہیں۔ صحابۂ کرام کی جانی و مالی قربانیوں سے تاریخ کے اوراق مزین ہیں۔ بخاری شریف کی حدیث ملاحظہ فرمائیے:۔

قال المقداد یوم بدر یارسول اللہ	معرکۂ بدر میں مقداد رضؓ نے کہا یارسول اللہؐ!
انا لا نقول لک کما قالت بنو اسرائیل	ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہ اُنھوں نے موسیٰ
لموسیٰ فاذهب انت وربك فقاتلا	علیہ السلام سے یہ کہدیا اذهب انت وربك
انا هٰهنا قاعدون ، ولکن	فقاتلا انا هٰهنا قاعدون۔ بلکہ آپؐ

اصحٰی و نحن معک (بخاری کتاب تفسیر)	تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

حضرت صدیقؓ کو خدا خود ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْھُمَا فِی الْغَارِ کا خطاب عالیہ عطا فرماتا ہے

خلفائے راشدین کے فاضل مصنف نے زرقانی کے حوالے سے ذیل کا واقعہ بیان کیا ہے
"حضرت ابو بکرؓ نے غارِ ثور میں پہلے داخل ہو کر اُس کو درست کیا۔ جو سوراخ اور پھٹ نظر آئے۔ ان کو بند کیا پھر آنحضرت صلعم سے اندر تشریف لانے کے لئے عرض کی۔ آنحضرت صلعم اس غار میں داخل ہوئے۔ اور اپنے رفیق و مونس کے زانو پر سر مبارک رکھ کر مشغولِ استراحت ہوئے، اتفاقاً اسی حالت میں ایک سوراخ سے جو بند ہونے سے رہ گیا تھا ایک زہریلے سانپ نے کاٹ کھایا۔ لیکن اس خادم جاں نثار نے اپنے آقا کی راحت میں خلل انداز ہونا گوارا نہ کیا اور خود اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اُس پر پاؤں رکھ دیا سانپ نے کاٹا، زہر اثر کرنے لگا۔ درد و کرب کے باعث آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے لیکن اس وفا شعار رفیق نے اپنے جسم کو حرکت تک نہ دی کہ اس سے آپ کے خواب راحت میں خلل اندازی ہوگی۔ ناگاہ آنسو کا ایک قطرہ ڈھلک کر آنحضرت صلعم کے چہرۂ انور پر ٹپکا، جس سے حضورؐ بیدار ہو گئے۔ اور اپنے مخلص، غمگسار کو بے چین دیکھ کر فرمایا۔ ابو بکرؓ کیا ہے؟ عرض کی "میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ سانپ نے کاٹ لیا۔" آنحضرت صلعم نے اُسی وقت اس مقام پر اپنا آب دہن لگایا، زہر کا اثر دور ہو گیا۔"

جنگِ بدر کے سلسلے میں مال و متاع روپے، پیسے اور اسلحہ و آلات کی بڑی ضرورت تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کبار سے راہ حق میں چندہ دینے کے لئے فرمایا۔ اتفاق سے اس وقت حضرت عمرؓ کے پاس کئی ہزار درہم تھے۔ آپ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اور اپنے دل میں کہنے لگے۔ کہ آج تو میں ضرور حضرت ابو بکرؓ سے مالی قربانی میں بڑھ جاؤنگا۔ غرضیکہ سب سے پہلے حضرت فاروق رضؓ نے اپنا چندہ رسولؐ پاک کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پیشکش پر سرورِ کائنات نے ارشاد فرمایا کہ اے عمرؓ! میں جانتا ہوں کہ جوش و ذکرِ حق سے آپ کے قلب کو طمانیت حاصل ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئے۔ کیونکہ صرف خدا ہی کے جوشِ ذکر سے دلوں کو سکون اور طمانیت حاصل ہوتی ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (بیشک، اللہ ہی کی یاد سے

دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے) ہاں یہ تو بتایئے کہ اپنے اہل و عیال کے لئے بھی کچھ بچا کر رکھا ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہر ایک مسلمان اپنے خویش و اقارب کا حق گذار ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا! کہ اسی لئے نصف مال میں نے اہل و عیال کو دے دیا۔ اور نصف مال ملتِ بیضا پر نثار کر دیا ہے۔

اسی اثناء میں رفیقِ نبوت بھی تشریف لے آئے۔ اور آپ نے لونڈی و غلام، درہم و دینار، رخت و جنس گھوڑے اور اونٹ، خچر اور گدھے، غرضیکہ سب کچھ لاکر نذرِ رسالت کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ گھر میں بچوں کے لئے کیا رکھا مَآ اَبْقَیْتَ لِاَھْلِكَ آپ نے جواب دیا کہ اللہ اور اُس کا رسولؐ۔
اَبْقَیْتُ لَھُمُ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ۔

صدیقؓ

اک دن رسولِ پاک نے اصحابؓ سے کہا　　دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
ارشاد سن کے فرطِ طرب سے عمرؓ اُٹھے　　اس روز اُن کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور　　بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
لائے غرض کہ مال رسولِ امیں کے پاس　　ایثار کی ہے دستِ نگر ابتدائے کار
پوچھا حضورِ سرورِ عالم نے اے عمرؓ!　　اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟　　مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار
کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار
اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا؛　　جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت　　ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
ملکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس　　اسپِ قمر سم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضور چاہیئے فکرِ عیال بھی　　کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار
"اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر　　اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار
پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کیلئے ہے خدا کا رسولؐ بس"

فارسی کی ایک رباعی بھی جس میں شاعر نے حضرت صدیق رضؓ کے مالی وجانی قربانی کی وضاحت کی ہے۔ ہمارے غور و فکر کو قوتِ عمل کی دعوت دے رہی ہے۔

آنکس کہ ترا بخواست جاں راچہ کند فرزند و عیال و خانماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی دیوانہ تو ہر دو جہاں راچہ کند

عمل کے سلسلے میں ہمارے فاضل محترم خان بہادر محمد مظہر صاحب پولیس کمشنر ریاست بہاولپور نے اقبال مرحوم کی ایک رباعی ارسال فرمائی ہے۔

"آپ فرماتے ہیں" ایک فارسی کی رباعی اور سُن لیجئے۔ اور داد دیتے رہیئے۔

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں راکہ خوش باش بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

اوپر والے اردو کے تیرہ اشعار اور فارسی کی رباعی بالا سے واضح ہے۔ کہ علامہ اقبال رحؒ نے ہماری قومی تصویر کے دو رُخ پیش کئے ہیں۔ تصویر کا پہلا رُخ تو وہ ہے جہاں مسلمان پیکرِ عمل نظر آتا ہے۔ اور تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ مسلمان اور خصوصاً ہندی مسلمان مجسمۂ بے عملی ہے۔

ذرا " فی سبیل اللہ " کے تعریضی لب و لہجہ پر غور فرمایئے۔ اور اس ظریفانہ و حکیمانہ اسلوبِ بیان کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

شاعر دل نواز بھی بات اگر کہے کھری ہوتی ہے اُس کے فیض سے مزرع زندگی ہری (اقبالؒ)

باباتے شیراز کا بیت بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

سعدی اور اقبال کے طرزِ بیان میں جو فرق ہے اس کا اندازہ با مذاق حضرات خود لگا سکتے ہیں یوں تو یہ تمام زیرِ بحث اشعار ہی ناظم اور شاعر کے فرق کو ظاہر کر رہے ہیں۔ لیکن ایک آخری شعر ایسا ہے جو قطعی طور پر شاعر اور غیر شاعر کے درمیان امتیاز پیدا کر دیتا ہے۔ اس شعر پر آئندہ سطور میں روشنی ڈالی جائیگی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت میں بیخود و وارفتہ ہیں۔ ایسی بیخودی و وارفتگی کہ جس نے آپ کو دنیا و مافیہا سے بیخبر کر دیا ہے۔ خدا خود حضرت صدیق کی تعریف میں فرماتا ہے ثانی اثنین اذھما فی الغار

رفیقِ نبوت کی ذات والا صفات کے ساتھ ہی بنائے عشق و محبت استوار ہے ؎
جس سے بنائے عشق ہے استوار
اقبال اہل علم کے غور و فکر کے لئے عشق صدیقی رضؓ کی تعریف ذیل کے اشعار میں فرماتے ہیں۔ علم و عشق کا یہ کیسا زبردست مقابلہ ہے۔ کیسے دلکش پیرایہ میں دونوں کی خصوصیات بتائی ہیں۔

علم و عشق

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن　　عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن　　عشق سراپا حضور۔ علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات　　علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات　　علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات، سلطنت و فقر و دین　　عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں　　عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب
شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام　　شورشِ طوفاں حلال لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام　　علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُم الکتاب

علامہ اقبال مرحوم کی ذیل کی نظم ایران کے مشہور شاعر رودکی کے قصیدہ[۱] کی طرح سادہ وسلیس ہے۔ لیکن اثر کے لحاظ سے دونوں میں زمین آسمان کا فرق

---

[۱] اس قصیدہ کے چند شعر یہ ہیں:-

یادِ یارِ مہرباں آید ہمے　　بوئے جوئے مولیاں آید ہمے
ریگ آموئے و درشتیہائے او　　پائے مارا پرنیاں آید ہمے
آب جیحوں و تشکر فیہائے او　　خنگ مارا تا میاں آید ہمے
اے بخارا شاد باش و شاد زی　　شاہ سویت میہماں آید ہمے
شاہ ماہ است و بخارا آسمان　　شاہ سوئے آسماں آید ہمے
شاہ سرو ست بخارا بوستان　　سرو سوئے بوستاں آید ہمے

ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امیر نصر بن احمد سامانی کو خراسان کی فتح کے بعد ہرات کی خوشگوار آب و ہوا اتنی پسند آئی۔ کہ وہ وہیں ٹھیر گئے۔ اور اپنے سامانی دارالخلافہ بخارا کو بالکل بھول گئے۔ امیر موصوف کے اس طویل قیام سے امرائے دربار اور فوجوں کے سپہ سالار جو کہ اپنے آرام دہ محلوں میں رہنے کے عادی تھے۔ بہت اکتا گئے، اراکین دربار نے باری باری امیر نصر بن احمد کو بخارا چلنے کے لئے ابھارا۔ مگر بدقسمتی سے سب اپنی مساعی میں ناکام رہے۔ آخر میں سب نے متحد ہوکر، رودکی سے عرض کی کہ حضرت آپ ہی اپنے ساحرانہ کلام سے پادشاہ کو بخارا چلنے کی ترغیب دلایئے۔ رودکی نے ان کی استدعا کے جواب میں ایک قصیدہ بخارا اور اس کی دلفریبیوں کے متعلق لکھا۔ اور جس وقت بزمِ نشاط آراستہ تھی، رودکی نے نہایت سوز و گداز کے ساتھ اشعار پڑھے امیر موصوف ان اشعار سے اس قدر متاثر ہوئے کہ "فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور بغیر موزہ پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر مع لشکر بخارا کو روانہ ہو گئے۔ اور دس کوس پر جا کر منزل کی"

بعض نکتہ چینوں کو جو شاعرانہ رموز و اسرار سے کماحقہ واقف نہیں ہیں رودکی کے قصیدہ مذکور میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ اور اُن کو امیر موصوف کے اس قدر متاثر ہو جانے پر حیرت ہے۔ رودکی کے قصیدہ نے صرف ایک ہی امیر کے قلب پر اثر ڈالا اور علامہ اقبال مرحوم کے تیرہ اشعار سے (جن میں حضرت ابوبکر صدیق کی مالی قربانی کا ذکر ہے) کروڑہا نفوس، امیر و کبیر، غریب و فقیر، بادشاہ و وزیر، فقیہ و دبیر، فلسفی و محقق غرضیکہ ہر طبقہ کے لوگ کم و بیش متاثر ہوتے رہیں گے۔ بیشک یہ "پیغام حیات ابدی" ہے

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل (اقبالؒ)

ان اشعار کی زبان کیسی پیاری ہے۔ اور ذیل کی آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ کا صحیح مفہوم کس خوبی و کامیابی کے ساتھ، شعر کے لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب

اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آ گیا

مَا اَبْقَیْتَ لِاَهْلِکَ
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا
بولے حضور چاہیئے فکر عیال بھی
اَبْقَیْتُ لَھُمُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس
لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر — اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

حالی مرحوم نے اپنے مقدمۂ دیوانِ حالی میں شاعر کی تین شرطوں کو ضروری بتایا ہے "ایک قوتِ متخیلہ، دوسری مطالعۂ کائنات، تیسری تفحص الفاظ، حالی فرماتے ہیں۔ سب سے مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے قوتِ متخیلہ ہے ۔۔۔۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے لیکر نکلتا ہے۔ اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے۔ اور باقی شرطوں میں جو کمالِ شاعری کے لئے ضروری ہیں۔ کچھ کمی ہے تو وہ اس کمی کا تدارک اس ملکہ سے کرسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ملکۂ فطری کسی میں موجود نہیں تو وہ شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ اور ماضی و استقبال کو اس کے زمانہ حال میں کھینچ لاتی ہے۔ وہ آدم اور جنت کی سرگزشت اور حشر و نشر کا بیان اس طرح کرتا ہے گویا اُس نے تمام واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ اور ہر شخص اُس سے ایسا ہی متاثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک واقعی بیان سے ہونا چاہیئے"؟

آئیے۔ حالی مرحوم کی اس فاضلانہ رائے کے معیار پر اقبال کے ان چند زیر بحث اشعار کو جانچنے پرکھیئے۔ حالی کے ان تنقیدی لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے۔ کہ اقبال کی قوتِ متخیلہ اتنی طاقتور ہے۔ کہ وہ سرورِ کائنات، صحابۂ کرام رض، اور جنگِ بدر کی تیاری اور اس کی ضروریات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے، اور جس طرح اقبال مرحوم خود صدیق اکبر رض کی مالی قربانی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان چند اشعار کا پڑھنے والا بھی متاثر ہوتا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رض نے مالی قربانی کی جو مثال پیش کی ہے۔

وہ دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ اقبال رح کو اس بات کا احساس ہُوا۔ کہ مسلمانوں میں مالی قربانی کا جذبہ بہت کم ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں "عمل کی صور و اشکال مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے ضروری سمجھتا ہوں" اور اگر کوئی شاعر یا رہنما اپنی قوم کو زندہ و باقی رکھنا چاہتا ہے " تو یقیناً وہ ماضی کے درسِ عبرت کو فراموش نہیں کر سکتا "

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

اقبال کا قلب و نظر، اسلامی روایات اور اسلامی فکر و عمل کی روشنی سے منور ہے ان کو جو والہانہ عشق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ہے۔ وہ وہبی و طبعی ہے بقولِ غالب ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اور علامہ مرحوم کا مقصدِ وحید، ہر طبقہ کے مسلمانوں میں، اپنے وجد انگیز اشعار سے اسلامی کیریکٹر پیدا کرنا ہے۔ اور کیریکٹر مجموعہ ہے خصائل حمیدہ و صفات جمیلہ کا۔ جس کا اسلامی نام " اُسوۂ حسنہ " ہے لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ اور اقبال اسی اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اسلامی کیریکٹر کا پرچار کرتا ہے۔ اور ان کا نصب العین اسلاف کے بے مثل کارناموں کے ذریعہ، مسلمانوں کے تن مردہ میں حیات و عمل کی روح پھونکنا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہدِ کہن رہتا ہوں میں اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

بقولِ حالی شاعری کی دوسری شرط کائنات کا مطالعہ کرنا ہے اقبال کے مطالعۂ کائنات کے متعلق تو کسی اور دوسرے مضمون میں ان کے کلام کے ذریعہ وضاحت کی جائیگی۔ یہاں تو صرف یہ عرض کرنا ہے۔ کہ انہوں نے نہ صرف تعلیماتِ اسلامی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ بلکہ اسلامی روح ان کے رگ و ریشہ میں اس طرح رواں دواں ہے کہ اسلام کے سُنہری زمانہ کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ (لَقَدْ کَانَ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ) اور صحابہ کبار کی اطاعتِ رسول کا نقشہ دل میں کالنقش فی الحجر ہے

بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ اقبال جیسا اسلامی شاعر حضرت صدیق اکبرؓ کے اس بے نظیر واقعہ کو اپنے شاعرانہ اور حکیمانہ کلام کے ذریعہ نہ بیان فرمائے۔ یہ اشعار بانگ درا میں درج ہیں۔ مگر دریافت طلب یہ امر ہے۔ کہ ہمارے مسلمان بچوں، جوانوں اور بوڑھوں میں کتنے ہونگے جنہیں یہ "شاہکار" یاد ہوگا۔ انگریزی اقوال شیکسپیئر کے اقتباسات ضرور ازبر ہیں، مگر یاد نہیں ہے تو قرآن پاک کی ہیجان پیدا کرنے والی آیات، اور خودی و خودداری اور مالی و جانی قربانی کا احساس پیدا کرنے والی منظومات۔ علامہ مرحوم کے کلام کی اشاعت کی اُس وقت تک ضرورت ہے۔ جب تک کہ ایشیائی اور خصوصاً ہندوستانی اقوام میں "خودی اور خودداری" کا صحیح جذبہ پیدا نہ ہو جائے اور مسلمان صحیح معنی ہیں، مالی و جانی قربانی کے صفات سے متصف۔ ان خصائص ملی کی تربیت اور قیام و دوام کے لئے بھی رہتی دنیا تک "اقبالیات" کا پرچار ضروری ہے۔ اقبال کا نصب العین یہی ہے۔ کہ ایک مسلمان مسلمان بن جائے اور وہ اسلامی خصوصیات کا حامل ہو جائے۔ اس لئے اقبالؒ کی تصانیف کی اشاعت ایک بڑی حد تک قرآن پاک کی تعلیمات کی اشاعت ہے۔ کسی شاعر نے اقبال کے اس زاویۂ نگاہ کی تصریح کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

کہا اقبال سے اک ہمنشیں نے ۔۔۔ سخن تیرا شراب آتشیں ہے
کچھ اس انداز سے گرما دئے دل ۔۔۔ کہ اب تسکین ممکن ہی نہیں ہے
حرارت ہے تیرے سوزِ نوا کی ۔۔۔ کہ بجلی سی دلوں میں جاگزیں ہے
کلام شاعراں پروردۂ عصر! ۔۔۔ مگر تیرا سخن عصر آفریں ہے
بدل ڈالا مذاق اس نے ہمارا ۔۔۔ دل اب طرزِ کہن پر نکتہ چیں ہے

ترے اشعار پڑھ کر اب نظر میں
کسی کی شاعری جچتی نہیں ہے

یہ سُنکر حضرتِ اقبالؒ بولے ۔۔۔ فقط لطفِ سخن کافی نہیں ہے
زمینِ شعر ہی میں گم نہ ہو جا ۔۔۔ فلک وہ ڈھونڈھ جسکی یہ زمیں ہے
مرے فکر فلک پیما کی پرواز ۔۔۔ ادب پروردۂ روح الامیں ہے
فروغِ عشق و سوزِ آرزو سے ۔۔۔ سخن میرا تب و تاب آفریں ہے

مگر میرے سخن کی روشنی بھی ... چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے
میرے اشعار میں پھنس کر نہ رہ جا ... اگر سالک رہِ یقیں ہے
تری نظروں میں ہیں میری تصانیف ... مری نظروں میں قرآنِ مبیں ہے
گذر جا تو مری بزمِ سخن سے ... رہِ قرآن میں گامِ اوّلیں ہے
جو تو اس طرح قرآن تک پہنچ جائے ... تو حاصل دولتِ دنیا و دیں ہے

محیطِ کائنات دل ہے قرآں
نظر کی آخری منزل ہے قرآں

ہندوستانی کا دلائل، حالی مرحوم، مطالعہ کائنات کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔ کہ شاعر میں "مختلف چیزوں سے منفرد خاصیت اخذ کرنے" اور جو امور مشاہدہ میں آئیں ان کے ترتیب دینے کی عادت" ہو۔ اور انہوں نے مثال کے طور پر غالب کا مقبولِ عام شعر، مقدمہ حالی میں پیش کیا ہے :۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل ... جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

حالی کے اس بیان کی روشنی میں علامہ اقبال کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے :۔

پروانہ کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

اقبال کا یہ ایک شعر اپنے اثر کے لحاظ سے جو شعر و شاعری کی علتِ غائی ہے۔ ناظموں کے ہزار ہا دیوانوں پر بھاری ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک
اور اس کی ادبی خوبی محتاجِ بیان نہیں۔ عیاں را چہ بیاں۔

بظاہر شاعر اور ناظم میں مشابہت ہے۔ مگر باوجود اس اختلاط اور التباس کے ان دونوں میں ایک حدِ فاصل ہے۔ جس کا احساس ایک با مذاق آدمی کو بدیر و زود، ہو جاتا ہے۔

حالی کے نقطۂ نگاہ میں تیسری شرط 'تفحصِ الفاظ' کی ہے۔ ذرا اس کسوٹی پر بھی اقبال مرحوم کے ان تیرہ شعروں کو کسیئے۔ ان اشعار میں جو سلاست و روانی ہے۔ اسے ہر پڑھنے والا محسوس کر سکتا ہے۔ البتہ ایک شعر کے متعلق جو ذیل میں درج ہے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ثقیل لفظ ہیں :۔

۵ ملکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس　　اسپ قمر سم و شتر و قاطر و حمار
بادی النظر میں اس شعر میں ثقالت نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اس شعر میں گھوڑا، اونٹ، خچر، اور گدھے کے الفاظ لائے جاتے تو اس شعر میں کوئی خوبی ہی نہ رہتی۔

ایک دفعہ حضرت عمرو بن العاص رض، حضرت سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مردوں میں آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے تو ارشاد ہُوا ابوبکر رض (بخاری شریف) ایک اور موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ ابوبکر اپنی صحبت اور مال کے لحاظ سے میرا سب سے بڑا محسن ہے (بخاری مناقب ابوبکر رض) مالی اور جانی قربانی ہی نے "رفیقِ نبوت" حضرت ابوبکر صدیق اکبر رض کو "خلافتِ راشدہ" کا چشم و چراغ بنادیا۔ اور صحابۂ کرام میں سے آپ کی خلافت کے باب میں کسی کو کوئی اختلاف نہ ہُوا۔ غرضیکہ آپ اپنے محاسن ظاہری و باطنی کی وجہ سے خلیفۂ اوّل منتخب ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رض کے چند مشہور واقعات اس لئے لکھے گئے ہیں۔ کہ اقبال کی نظم کے (جو اُنہوں نے صدیق اکبر رض کی مالی قربانی سے متاثر ہو کر لکھی ہے) اسیاق و سباق کی وضاحت ہوجائے۔ اور اُس (نظم) کی اہمیّت واضح۔

ہمارے لئے یہ نظم بہترین درسِ عمل" ہے۔ اقبال رح کو احساس ہے کہ مسلمانوں کی تمام تحریکیں اس لئے ناکامیاب ہیں کہ وہ مالی قربانی کے جذبہ سے کلیتاً محروم ہوچکے ہیں، اگر دس کروڑ مسلمانوں میں سے ایک کروڑ مسلمان ایک ایک آنہ ماہانہ بھی دیں، اور باقاعدگی کے ساتھ دیں۔ تو سوا چھ لاکھ روپیہ ماہوار اکٹھا ہو سکتا ہے اور "اقبالیات" کے پرچار کا اعلےٰ پیمانہ پر انتظام، واقعہ یہ ہے کہ مالی قربانی میں مسلمانوں کی تمام مذہبی و اقتصادی ضروریات کا حل مضمر ہے، ایک وہ تھے جنہوں نے سب کچھ لاکر نذرِ رسالت کردیا ایک ہم ہیں کہ ایک آنہ ماہانہ بھی باقاعدگی کے ساتھ نہیں دے سکتے ؎

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے
ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ

مسلمانوں کا ماضی "عمل کی صور و اشکالِ مختلفہ" یعنے مالی اور جانی قربانیوں کا کارناموں سے لبریز ہے۔ اور مسلمانوں کا حال، "قال اقوال" کے فلسفی مباحث سے پُر۔ اور

عمل سے بیگانہ۔ قرآن کا درس "درسِ عمل" ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ o کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ o (ترجمہ:- ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے۔ کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔ ترجمہ مولانا شاہ اشرف علی صاحب مدظلہ العالی)

قوموں کی بنا و عمارت ایک ہی بنیادی اصول پر مبنی ہے۔ اور وہ ہے عمل۔ اور قوموں کا زوال ایک ہی اصولی چیز پر منحصر ہے۔ اور وہ ہے بے عملی۔ اور بے عملی کے اسباب و مراتب ہیں' تعیش' روحِ رواں ہے۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تاریخِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سنان اوّل طاؤس و رباب آخر
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر (اقبالؒ)

جب قوم کے افراد کا روپیہ تعیش و تن آسانی یعنی سینما وغیرہ میں صرف ہو تو پھر مالی قربانی کیونکر ہو سکتی ہے اور مسلم نوجوانوں کی تن آسانی و بے عملی اقبال کو خون کے آنسو رُلاتی ہے ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی (اقبالؒ)

باقی باقی

اقبال اور تخلیقی فراست

(از ذکاء الملک خواجہ ڈاکٹر ایف۔ ایم شجاع منعمی۔ ایم اے (علیگ) بی ایس سی آنرز) ایم اے (پنجاب) ایم۔ ایس۔ سی + ایم ایچ ایس ایس (امریکہ) پی ایچ ڈی ایم آر ایس ایل لندن)

لوہا۔ تانبا۔ شیشہ وغیرہ تو پہلے ہی دُنیا میں موجود تھے۔ تو ریڈیو بنانے والے سائنیدان نے کونسا تیر مارا؟ اس نے اپنی عقل سے ایک نئی تجویز کی۔ ریڈیو کی کرامت موجد کی عقل میں ہے۔ لوہے تانبے میں نہیں۔ اس کا تخلیقی فراست (CREATIVE GENIUS) ہے۔

انسان

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم　　　سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی　　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم　　　(اقبالؒ)

(تو سے خطاب خدا کی طرف ہے از محاورہ مابین خدا و انسان - پیام مشرق)

لوہا۔ تانبا لاکھوں برس یکجا پڑے رہتے۔ اور اگر عقل بیچ میں نہ آتی۔ تو بے حس حرکت اور بے رنگ و بو تھے۔ کچھ حاصل نہ ہوتا۔

یہ تخلیقی فراست (CREATIVE GENIUS) ہی بنی نوع انسان کی عظمت کا سبب ہے۔ اور یہی کسی کی ذہانت، عقل و شعور، فہم یا ادراک کی قدر و قیمت پرکھنے کے لئے معیار ہے۔ کہ اس عقل و شعور نے ہمارے موجودہ علم اور واقفیت میں کیا اضافہ کیا۔ اور یہ اضافہ کس رفعت اور وسعت کا ہے۔ اس کا اثر اولادِ آدم کے تمدن۔ تہذیب اور زندگی کے مختلف شعبوں پر کیا ہوا۔

نابغہ (GENIUS) کی قوتوں اور کیفیتوں کا اندازہ ہم ان معمولی

اصولوں سے نہیں لگا سکتے۔ جو ہم عامۃ الناس کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ ایک فوق العادہ ادراک اور فہم کا مالک ہے۔ اس کے اصول مختلف۔ اس کا معیار جداگانہ اس کا علم لدُنی۔ یعنی ایک ایسا ملہم جس کو قدرت نے سقم اور صحت حسن اور قبح میں تمیز کرنے کا ملکہ پیدائش سے پہلے عطا کر دیا ہو۔ یہ شعور اس کے لئے اکتسابی ( ) نہیں فطری ( ) ہے۔ اس کی عقل سلیم پر کیفیتوں کی حقیقت از خود منکشف ہو جاتی ہے۔ ایڈیسن نے گراموفون ایجاد کیا۔ نہ کبھی اُستاد نے اسے علم الاشیاء پڑھایا۔ نہ اس نے کتاب میں کبھی اس کی بناوٹ کو دیکھا۔ مولٰنا عبدالحکیم سیالکوٹی نے پنجاب میں عمر گزاری۔ مگر عربی میں ایسی کتاب لکھی کہ مصر کے مکتبوں میں اب تک پڑھائی جاتی ہے۔ امیر خسرو دہلوی نے ہندی نژاد ہوتے ہوئے ہزارہا اشعار فارسی کے لکھے۔ جن سے فارسی والے سند لیتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال نے کبھی سرزمین ایران میں قدم نہ رکھا مگر فارسی میں اظہار خیال کیا۔ افکار اور زبان میں وہ جدت پیدا کی۔ کہ عقل فارس ششدر ہے ایرانی کہتا ہے " اللہ اکبر یہ لکھنے والا ایرانی ہے " یہی نابغہ ہے جس کا مسکن عوام کی رسائی سے بالاتر ہے۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ ڈاکٹر اقبال صاحب بڑے ذہین تھے۔ اور ذہانت کا اظہار زندگی کے ہر شعبے میں ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔

شاعر کیا کرتا ہے؟ وہی الفاظ جنہیں آپ جانتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں۔ وہی استعارے اور تشبیہیں نئے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ انہیں نئے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ وہ نابغہ (GENIUS) ہے۔ وہ الفاظ دنیا میں موجود تھے۔ مگر افکار جو اس کے ذہن نے پیدا کئے۔ وہ دنیا میں موجود نہ تھے۔ اس لئے شاعر تخلیقی فراست (CREATIVE GENIUS) کا صاحب ہے۔ اس کے منہ میں دنیا کے الفاظ اس شاعر کے الفاظ ہو جاتے ہیں۔ اور ایک نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اب ان کے پڑھنے سے ایک نئی کیفیت ہمارے ذہن میں آتی ہے۔ جو ان الفاظ کو ہزار دفعہ اس سے قبل پڑھنے سے حاصل نہ ہوئی تھی۔

شاعر کون ہے اس کا جواب علامہ اقبال نے خود بہت دفعہ اپنے کلام میں دیا ہے :-

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم — منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم — شاعرِ رنگیں بیاں ہے دیدۂ بینائے قوم (بانگِ درا)

پھر
سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن — خیزد از سینائے او انوارِ حسن الخ

اور
وائے قومے کز اجل گیرد برات — شاعرش وا بوسد از ذوقِ حیات

مقصود یہ کہ شاعر کا کام ہے قوم کی حالت درست کرنا۔ عیوب پر نکتہ چینی کرنا۔ اور فلاح کا راستہ بتانا۔

اب یہ مان لیا کہ علامہ اقبال نابغہ ہے تو مدارج میں اُس کا رُتبہ کیا ہے۔ شاعرِ مشرق کئی صدیوں میں ایک دفعہ ظہور میں آنے والی تخلیقی فراست کا صاحب تھا۔ اس کی ذہنی تخلیق سے ایک دنیا جاگ اُٹھی۔ اس کے خیالات سے کئی ممالک کی زندگی میں خروش پیدا ہو گیا خوابیدہ روحوں میں حرکت پیدا ہو گئی۔ شاعر کی مخلوق نے لوگوں کے دلوں میں ایک نئی دُنیا آباد کر دی

اقبال کی شاعری حسیات اور جذبات کی شاعری نہیں ہے۔ وہ برسات کی بھیگی ہوئی ہوا اور بہار کے عنبر ریز جھونکوں میں ہمارے دل کے ساتھ اٹکھیلیاں نہیں کرتا۔ بلکہ عقل علم اور عشق سے کارزارِ ہستی میں فتح پاتا ہے۔ وہ قوموں کے سامنے ایک لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ کامیابی کی راہیں بتاتا ہے۔ اور روشن مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے اقبال نے اس گرانقدر اضافے سے جو دنیا کے علم و عقل میں اس کی معرفت وجود میں آیا۔ دوام کے قصر میں اپنے لئے مستقل جگہ بنا لی۔

ایک اور نکتہ ہے آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ اس لئے ابھی ذکر کئے دیتا ہوں وہ ہیرا جو اقبال کی شاعری کے قالب میں وجود میں آئی ہے۔ اپنے تیج و تاب گوناگوں الوان سے کب تک دلہائے رنگین کی توجہ کا مرکز بنی رہیگی۔ جو رَو زمانے کی رَو کے ساتھ بہتی ہے عرصے تک قائم رہتی ہے۔ جو قوت بہاؤ کے خلاف عزم کرتی ہے وہ اگر جلد ناپید نہ ہو جائے۔ تو منجدھار سے ایک طرف ضرور ہٹ جاتی ہے۔ زمانے کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ میں نے اس کا ذکر کیا ہے ذکر چھیڑا نہیں۔ نہ ہی یہاں اس کے لئے جگہ تھی مجھے کہا گیا تھا — کہ بساط بہت مختصر ہے۔ اختصار کی نظر سے میں نے مفہوم تو گم نہیں کیا۔

دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگاہے گاہے (اقبالؒ)

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

رباعی

[illegible]

[illegible]

چند لمحات

"اُن سے گفتگو"

تعطیلات شروع ہونے والی تھیں۔ انور کے متواتر خطوط آ رہے تھے کہ اس مرتبہ چھٹیاں لاہور ہی میں گزاری جائیں۔ انور سے میرے مراسم دیرینہ تھے۔ ہم نے بچپن کا معصوم مگر جلد ختم ہو جانے والا زمانہ ساتھ ہی کھیل کود کر گزارا تھا۔ یہ ایک محض اتفاق سمجھئے۔ کہ اس سے ملے ہوئے کئی برس گزر چکے تھے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ ؎

اے ذوقؔ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

رختِ سفر لاہور کے لئے باندھ لیا اور جمعرات کی شام کو روانہ ہو گیا۔

انورؔ ہمہ تن انتظار تھے۔ میں پہنچا۔ خوب جی بھر کے ملے۔ مجھے ڈاکٹر اقبال سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اور اس بات کا بھی علم تھا۔ کہ انورؔ کے والد محترم اسلم صاحب کے اُن سے خاصے مراسم تھے۔ یہ لوگ اُن کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ میں نے انورؔ سے کہا "دوست چھٹیاں ہیں بہت تھوڑی سی" لاؤ پروگرام بنا ڈالیں۔ اور آج کے پروگرام میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کر لی جائے۔ ممکن ہے؟

انورؔ نے اپنے مخصوص تبسم آمیز لہجے میں کہا "ہاں کیوں نہیں۔ قوم کے نوجوانوں سے تو مل کر انہیں بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ جو لوگ دورِ انحطاط میں قدم دھر چکے ہیں۔ وہ تو میدانِ حیات میں آنے کا مقصد کم و بیش پورا کر چکے ہیں اس سے بحث نہیں کہ اُنہوں نے قوم و وطن کے لئے کیا کیا۔ ہاں البتہ نوجوانوں کی ذات سے کچھ اُمید وابستہ کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اُنہیں سیدھے راستے پر لگا دیا جائے۔ تو اُن سے بہتیرے کام لئے جا سکتے ہیں۔"

"اور کس قسم کے آدمی ہیں؟ کچھ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور تنک مزاج تو نہیں؟" میں اپنے تجسس کو چھپانے کی ایک "سعیِ لاحاصل" کر کے بولا۔

انورؔ نے اپنی معلومات کی "عظمت" کو برقرار رکھتے ہوئے کہا "نہیں! نہیں! بہت ہی خوش مزاج اور "سنس اُوف ہیومر" کے مالک۔" میں تمہیں اُن کے ایک دو لطیفے سنا دوں تب تمہیں اُن کے متعلق صحیح اندازہ ہو جائیگا۔ غالباً تم نے سُن رکھے ہوں گے اس لئے

کہ وہ بہت ہی مشہور ہو چکے ہیں۔

سر شہاب الدین گورنر کی کونسل کے صدر بہت ہی سیاہ رنگ کے آدمی ہیں۔ ایک مرتبہ شہر کے تمام عمائدین ورؤسا ایک ڈنر میں مدعو تھے۔ قاعدے اور وقت کے مطابق سب کے لباس سیاہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جونہی سر شہاب الدین کو کالے لباس میں دیکھا تو فرمانے لگے "چودھری جی! آج تے ننگے ننگے ہی آ گئے او" یہ فقرہ علامہ موصوف کے مُنہ سے نکلنا تھا کہ کمروں کی فضا قہقہوں سے گونج اُٹھی۔

اسی طرح ایک مرتبہ کوٹھے پر بیٹھے ہوئے ستار بجا رہے تھے۔ جوانی کے دن تھے، نیچے سے ایک سکھ صاحب گزرے۔ ملنے والے تھے لیکن تھے جلدی میں۔ اُن کے پاس اتنا وقت نہ تھا۔ کہ اُوپر آ کر مزاج پُرسی کرتے۔ نیچے ہی سے طنزاً بولے "کیوں جی وجاندے پے او" ڈاکٹر علیہ الرحمۃ نے اوپر ہی سے برجستہ جواب دیدیا "ہاں پاپا۔ سکھنی جے ہوئی" وہ حضرت بغیر کچھ ارشاد کئے چپ چپاتے روانہ ہو گئے۔

حاضر جوابی اور بذلہ سنجی تو بچپن ہی سے تھی۔ کیونکہ یہ کمال اکتسابی تو ہے نہیں۔ فطرت کا انعام ہے۔ جس پر چاہے نظرِ انتخاب ڈال دے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُستاد نے پُوچھا "اقبال! کیا بات ہے۔ تم ہمیشہ دیر سے آتے ہو؟"

اس نونہالِ مشرق نے جواب دیا۔ سُبحان اللہ! فرمانے لگے "جی ہاں! اقبال دیر ہی سے آیا کرتا ہے"

اور اسی قسم کی باتیں سُنا سُنا کر میرے شوق کو بڑھا رہے تھے۔ کہ پوچھنے لگے "اچھا! وہ پُوچھیں گے کیسے آئے۔ تو کیا جواب دینگے؟"

"تم مطمئن رہو۔ مَیں نپٹ لوں گا" میں نے ٹانگے سے اُترتے ہوئے کہا۔

پہلی فرصت میں پروگرام بنا لیا گیا۔ سینما۔ تھیٹر، سرکس۔ گھوڑ دوڑ، پولو۔ غرضیکہ اس میں تمام چیزیں شامل تھیں۔ جلدی سے کپڑے بدل کر انور اور مَیں ڈاکٹر صاحب کی طرف چل دئے۔ بنگلے پر پہنچ کر اندر اطلاع کرائی۔ باریابی کی اطلاع فوراً مل گئی۔ اندر پہنچے۔ تو دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف حقہ نوشی میں معروف ہیں صورت پر رعب و جلال برس رہا تھا۔ ماتھے کی شکنیں غزالی کے فلسفہ اور رازی کے علم کی علمبردار تھیں آنکھیں شاہانہ اسلاف

کی عظمت رفتہ پر مرثیہ پڑھنے کے علاوہ کسی آنے والے عروج کی اُمید پر قصیدہ پڑھتی معلوم ہو رہی تھیں۔ ابو طوسی اور ابن سینا کی یاد کو زندہ کر رہے تھے۔ کمرے میں فرنیچر مختصر سا تھا۔ تسلیم و آداب کے بعد ہم دونوں ایک کاؤچ پر بیٹھ گئے۔ علامہ اقبال نے مزاج پوچھا۔ ہم نے ان کی خیریت پوچھی۔ اُنہوں نے نزلہ اور کھانسی کی شکایت کی، انداز سے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اصل موضوع کی طرف جلد لوٹ آنا چاہتے ہیں۔ فرمانے لگے "کیسے آئے؟ فضائے بسیط میں ان کی آنکھیں کسی آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر دیکھتی معلوم ہو رہی تھیں۔

میں نے عرض کیا "ایک شعر ہے جناب والا بالِ جبریل میں" جبریل اور ابلیس کی گفتگو" کے عنوان کے ماتحت معنے سمجھ میں نہ آسکے۔ استفادہ کی غرض سے حاضر ہُوا ہوں"

"کہو! اُنہوں نے شفقتِ پدرانہ سے کہا

جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا

وہ فوراً متوجہ ہو بیٹھے۔ فرمانے لگے "اس سے پہلے کے چند اشعار میں حضرت جبرئیلؑ نے شیطان کو خُدا سے معافی مانگنے کے لئے ع کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو" کہہ کر توجہ دلائی ہے۔ اس شعر میں ابلیس اُن کے اسی اصرار کا جواب دے رہا ہے۔ اب اس شعر کا مطلب سنو!

تم نے دنیا میں دیکھا ہوگا ایک بھائی دوسرے بھائی کا جَو کی باسی روٹی کے ٹکڑے کے لئے گلا کاٹ ڈالتا ہے۔ انسان جنگلی مجروح سوٌر سے زیادہ خوفناک ہو کر دست و گریبان ہو جاتا ہے۔ وُہ لوگ جو مذہبی پیشوائی کا نہ صرف دعوٰے ہی کرتے ہیں بلکہ سمجھے بھی جاتے ہیں۔ ان کے تقدس پر ایمان لایا جاتا ہے۔ حجروں میں بیٹھ کر یتیموں اور بیواؤں کا مال آسانی سے نگل جانے کے لئے حدیثیں بناتے رہتے ہیں۔ یہ تُلی ہوئی ڈاڑھیوں اور نپے ہوئے پائجاموں والے قال اللہ و قال الرسول کے پردے میں مکتبوں میں بیٹھ کر فریب کاری اور جعلسازی کے نئے نئے سبق سیکھتے ہیں۔ یہی انسان جسے اپنی شرافت پر ناز ہے۔ اس قدر گناہوں کا ارتکاب کر گزرتا ہے کہ فرشتے اس کے گناہ کو اس کے نامہ اعمال میں درج کرتے ہوئے بھی شرماتے ہیں۔ چند گز زمین کے لئے یہ خدا کی تمام تر مخلوق کو پنجۂ ظلم کے تلے روند ڈالنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ یہ مسجد و شوالہ میں بیٹھ کر وہ کرتا ہے جو اسے "کسی

کے چوبارے پر بھی کرتے ہوئے لاج آنی چاہیئے۔ غرضیکہ اس کی شادی، اس کی موت، اس کی پیدائش اس کا بیاہ ہر چیز ہی ایک ہنگامہ ہے۔ ایک ہماہمی ہے چاہو تو اسی شور و شغب کو رونق کہہ لو اور چاہو تو اسے ہنگامہ ہی سمجھو۔ اس لئے کہ رونق اور ہنگامہ میں اتنا ہی تو فرق ہے کہ رونق بُری لگی تو اُسے ہنگامہ کہہ لیا۔ اور اگر ہنگامہ اچھا نہ لگا تو اسے رونق کہنے لگے۔ اب ہمارے اور شیطان کے سمجھنے میں بھی یہی فرق ہے۔ کہ جس چیز کو شیطان رونق سمجھتا ہے یا بالفاظ شعر "سوزِ درونِ کائنات" (جس سے مراد سوز و سازِ زندگی ہے) سے تعبیر ہمارے نزدیک ہنگامہ ہے اور ہم اُسے "رزم خیر و شر" کہتے ہیں یعنی اس وقت دنیا میں جتنے فسادات ہنگامے اور شورشیں ہیں سب کی سب بھلائی اور بُرائی یعنی خیر و شر میں جنگ کا ظاہر سا نتیجہ ہیں۔ اور یہ بھی واضح سی چیز ہے کہ دنیا کی بقا کے لئے اس میں سوز و ساز پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اگر ابلیس جنت سے نہ نکالا جاتا تو رزم خیر و شر کا وجود ہی نہ ہوتا۔ دنیا مرکب ہے بھلائی اور بُرائی سے ان دونوں میں تصادم لازمی ہے۔ اور اسی کا نام دنیا کی بقا ہے۔ اس شعر میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں آیا ہے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو) سو اگر شیطان بھی باری تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اس کی رحمتوں سے مایوس نہ ہوتا یعنی آس لگائے رہتا۔ تو ہرگز اس کے بندوں کو گمراہ نہ کرتا۔ اور جب انسان گمراہ ہی نہ ہوتے بلکہ ہر ایک سیدھے سچے اور ہدایت کے راستہ پر چلتا رہتا تو دنیا میں "رزم خیر و شر" ہی نہ ہوتی حالانکہ دُنیا کی بقا کے لئے اس کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ چونکہ دنیا اسی کا نام ہے۔ اس لئے شیطان کا اللہ کی رحمتوں سے مایوس ہو جانے ہی کی صورت میں "سوزِ درونِ کائنات" پیدا ہو سکتا ہے۔ جو "رزم خیر و شر" کا مترادف ہے۔ اور یہی چیز حیاتِ کائنات کے لئے آبحیات کا حکم رکھتی ہے۔ اب مطلب صاف ہے۔ ابلیس کو چونکہ حضرت جبرئیلؑ باصرار خدائے قدوس سے معافی مانگنے کے لئے اس نظم کے چند پہلے اشعار میں مجبور کر چکے ہیں، اس لئے ابلیس معافی نہ مانگنے کی وجہ بتلاتا ہے۔ کہتا ہے "میں خدا کی رحمتوں سے مایوس ہو چکا ہوں، اور جانتا ہوں کہ میرے لئے عفو اور رحمت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔ اور دُنیا کی بقا کے لئے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ میری خدا کی رحمتوں سے ناامیدی ہی ہے جس کی وجہ سے میں اُس کے بندوں کو گمراہ کرتا رہتا

ہوں۔ بُرے اور بھلے بندوں میں تصادم ہوتا ہے۔ یا بالفاظِ دگر کائنات میں سوز وساز پیدا ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مضراب اور رباب کے تاروں کی رگڑ سے ایک نغمہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب چاہے آپ اسے سوز کہہ لیجئے چاہے ساز۔ اب ایسی صورت میں جبکہ میری ناامیدی اور مایوسی ہی دنیا کی بقا کی سب سے بڑی وجہ ہو تو دنیا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے مایوس ہی رہنا چاہئے۔ یا آس رکھنی چاہئے؟ یقینی طور پر میرے لئے ناامیدی ہی بہتر ہے۔ کیونکہ اگر میں خدا کی رحمتوں سے اُمید رکھنے لگونگا۔ تو "سوزِ درونِ کائنات" ختم ہو جائیگا۔ اور یہ کائنات کی موت کے مترادف ہے۔ لہٰذا لَا تَقْنَطُوْا انسان کے لئے تو مناسب ہے لیکن میرے لئے تَقْنَطُوْا (ناامید ہو جاؤ) ہی زیادہ بہتر ہے۔" اس نظم کے زیرِ گفتگو شعر کے بعد کے اشعار میں ابلیس کے ذریعہ اسی شعر کی تشریح کرائی گئی ہے، اور بتلایا گیا ہے کہ "سوزِ درونِ کائنات" میں اس کی شخصیت کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ سنو! ابلیس جبرئیلؑ سے کہتا ہے ؎

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے "رزمِ خیر و شر"
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟
خضرؑ بھی بے دست و پا الیاسؑ بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا جُو بہ جُو
گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدمؑ کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

ان اشعار میں بھی ابلیس نے یہی بتایا ہے کہ دُنیا میں "رزمِ خیر و شر" پیدا کرنے کے لئے اس نے کس قدر جدّ و جہد سے کام لیا۔ ہزاروں مشکلات برداشت کیں لیکن اس ہنگامے کو جاری رکھا جو دُنیا کی زندگی کے لئے ازحد اہم ہے حتّٰی کہ قصۂ آدم کو رنگین کرنے کے لئے اپنے خون سے بھی دریغ نہ کی۔ اگر حضرتِ آدمؑ ہمیشہ جنّت ہی میں رہتے تو یہ دُنیا معرضِ ظہور میں نہ آتی۔ اور جب یہ دُنیا ہی نہ ہوتی تو نہ "سوزِ درونِ کائنات" ہوتا اور نہ "رزمِ خیر و شر" نہ کنار اقدس میں یہ جنگیں ہوتیں نہ انبیاء آتے نہ اولیاء بنتے۔ نہ

دہریے ہوتے نہ فلسفی و حکما آتے۔ یہ تھیئٹر یہ تماشہ یہ ہنگامہ اور یہ تمام رونقیں سب اسی کی بدولت ہیں۔ اُسی نے ہی دنیا اور موجودات دنیا کو پیدا کرنے کے لئے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اپنا مرتبہ، اپنا علم، اپنا درجہ، اپنی فضیلت حتیٰ کہ اپنی جان عزیز پر کھیل کر ارشادِ ربانی کے خلاف سر اُٹھایا۔ اور وہ یہ سب کچھ نہ کرتا تو حضرت آدم کو کون جانتا۔ اُن کی کیا اہمیت ہوتی۔ لیکن شیطان نے قصۂ آدم کو اور اولادِ آدم کو ایک سٹیج پر لا کر مختلف پارٹ کرانے کے لئے اپنا خون صرف کر دیا۔ خواہ یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر ہُوا۔ لیکن ہُوا تو۔ قصۂ آدم کو دلچسپ افسانہ بنانے کے لئے شیطان کو کیا ملا؟ خدا کی لعنت فرشتوں کی پھٹکار۔ اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ۔ یہی نا۔ لیکن اُس نے پھر بھی اس سودے کو سستا جانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں یہ سب تماشے دیکھنے کا کس قدر شیدائی ہے۔ پھر وہ خُدا کی رحمتوں سے مایوس نہ ہو جائے تو کیا کرے۔ کیونکہ جونہی وہ آس لگا بیٹھیگا، "سوز و درونِ کائنات" ختم ہو جائیگا۔ اور اس کے ساتھ کائنات بھی۔

آخری شعر میں بھی شیطان اپنی عظمت اور جبرئیلؑ کی پستی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ جبرئیلؑ سے یہ کہنا چاہتا ہے۔ کہ تمام عمر حمد و تسبیح کرتے رہے لیکن عزاسمہٗ نے تمہارے ساتھ کوئی خاص بھلائی نہیں کی اور تم قابلِ رشک مرتبہ نہ پا سکے۔ برخلاف اس کے میں نے ایک گناہ کیا۔ اور اس قدر بلندی اختیار کر لی۔ کہ ربِّ اعلیٰ کے دل میں قیام رکھتا ہُوں، خواہ وہ رہنا نہ سہی کھٹکنا اور رڑکنا ہی ہو بہرکیف ارتباط تو پایا جاتا ہے چاہے وہ کسی صنف سے متعلق ہو ——— چاند اور چکور کا ارتباط یا گل و گلچیں کا ارتباط۔

مَیں حیران تھا۔ کہ میں اسی عالم آب و گل میں ہُوں یا کسی ایسی دُنیا میں جہاں علم و فراست مینہ برساتی ہے۔ تہذیب و آگہی پھول کھیرتی ہے۔ فلسفہ و بصیرت موتی رولتی ہے۔

حقہ کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہی یہ طلسم ——— مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور لیکن عذرا سے زیادہ عزیز و حسین طلسم ٹوٹ گیا اور یہ حسرت چھوڑ گیا اور آج تک ہے کہ اے کاش یہ طلسم کبھی نہ ٹوٹتا۔ زمین اپنے محور کے گرد چکر کھا کھا کر تھک جاتی۔ سورج اپنی گرمی سے پگھل جاتا۔ چاند کا نور پھیکا پڑ جاتا۔ تاروں کی جگمگاہٹ مدھم ہو جاتی۔ پہاڑ بستیاں اور بستیاں ویرانہ بن جاتیں۔ آسمان دھرتی۔ اور زمین آکاش بن جاتی۔ مشرق و مغرب

کا فرق ہو جاتا۔ گل وعندلیب کی چھیڑ اور داستانِ خسرو شیریں دماغوں سے محو ہو جاتیں سکندر اعظم اور محمود غزنوی کو دُنیا بھُول جاتی۔ ہلاکو اور تیمور کا کوئی نام نہ لیتا۔ غالب۔ امراء القیس اور حافظ دماغوں کی دنیا سے رختِ سفر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُٹھا لیتے، سب ختم ہو جاتے لیکن اے کاش کہ یہ طلسم نہ ٹوٹتا۔

اللہ اللہ! کہاں ہیں اب وہ محفلیں اور کہاں ہیں وہ محفل والے شمعیں بجھ چکیں، بساطیں اُلٹ چکیں۔ رونقِ محفل اُٹھ گیا۔ اور آج وہی شعر جو اس نے داغ مرحوم کے لئے کبھی لکھا تھا۔ اس کے لئے ڈبڈباتے ہوئے آنسوؤں۔ خون بہاتے ہوئے دلوں اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے نقل کیا جا رہا ہے ؎

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

مرحوم کے ڈاکٹر شجاع مدظلہ سے گہرے مراسم تھے۔ علامہ موصوف عام طور پر تصویر نہیں کھچوایا کرتے تھے لیکن چونکہ انہیں ڈاکٹر شجاع علامہ مرحوم سے ایک شعر سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ انمول تصویر ڈاکٹر شجاع کی نشستگاہ میں آویزاں ہے اور کمرے کی رونق کی بڑی حد تک ذمہ وار و آئینہ دار۔ اس کی قیمت و اہمیت کا اندازہ یا تو ڈاکٹر شجاع ہی کر سکتے ہیں یا وہ اربابِ نظر و بصیرت جنہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ اقبال کی پیدائش مشرق کے حق میں ثریا نصیبی و فلک بخشی تھی۔ اور خدا کے کرمِ لامتناہی کی بیّن دلیل جس نے مشرق کے آکاش کو اس روشنی و گرمی دینے والے سورج کا نور و کیف پھیلانے والے چاند اور رشد و ہدایت دکھانے والے تارے سے جو ایک اقبال کی صورت میں آیا، نوازا۔ وہ سورج چھپ گیا ہے۔ وہ چاند غروب ہو گیا ہے۔ وہ تارا جھلملا چکا ہے۔ اے خدائے رحیم و کریم! ہمارے جسم یخ بستہ ہو گئے ہیں۔ ہم میں انجماد پیدا ہو گیا ہے۔ حرارت کی ضرورت ہے، حمیّت کا احساس درکار ہے۔ نور کا علم زائل ہو چکا ہے۔ کیف صہبائے سخن اُتر چکا ہے، ہم غلط راستے پر لگ گئے ہیں۔ ہماری راہ میں عمیق گھاٹیاں، خوفناک غار اور اتھاہ سمندر ہیں اے بخشنے والے! ہمیں ہمارا اقبال بخشدے۔ تجھے تیرے سورج، تیرے چاند، اور تیرے تاروں کی قسم۔ وہ سورج، چاند، تاروں والے اَن داتا۔ ہمیں وہی طور سورج وہی چاند اور وہی تاروں کا تارا دیدے۔ ہمیں اس پیغمبرِ سخن کی چاہ ہے ہمیں واپس دیدے۔

محمد ساجد۔ بی اے (آنرز) ایم اے
(اولڈ بوائے)۔

رُباعیات

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

خودی کے زور سے دُنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بُو کا راز پا جا
برنگِ بحر ساحل آشنا رہ
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

قطعہ

کل اپنے مریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے
قیمت میں یہ معنی ہے دُرِ ناب سے دہ چند
زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند

(اقبالؒ)

اقبال رحمۃ اللہ علیہ

اقبال ایک شاعر تھا، جس کی شاعری اُس کی دماغی کاوش اور ذہنی فکر کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اس کے شعروں میں وارداتِ قلبی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس کے کلام میں شیریں بیانی ہے۔ اس کے کلام میں درد ہے۔ اس کے کلام میں تاثیر ہے اس کے حرف حرف میں رنگینیاں مسکراتی ہیں اور اُس کے لفظ لفظ میں فلسفۂ حیات مضمر ہے۔

اقبال ایک فطرتی شاعر تھا جس کی نگارشِ قلم نے فطرت کا اس قدر صحیح خاکہ کھینچا کہ جس سے حقیقت کی جھلک عیاں ہو کر رہ گئی۔

اقبال ایک قومی شاعر تھا۔ جس نے اپنی قوم کی گری ہوئی حالت پر خون کے آنسو روئے۔ اور انہیں خواب غفلت سے بیدار کیا۔

اقبال ایک شاعرِ انقلاب تھا جس کے تخیلات اور جذبات نے دنیا میں نئی روح پھونک دی۔

اقبال ایک عاشقِ صادق تھا ــــ جس کا دل حضور سرورِ کائنات کی محبت سے روشن تھا۔ جو فخرِ موجودات کے عشق میں دیوانہ تھا۔

اقبال ایک موحّد تھا ــــ جو مسئلۂ توحید کے رموز و اسرار سے واقف تھا۔ اور جس نے اپنے کلامِ معجز بیان کے ذریعہ اس کی تبلیغ و اشاعت فرمائی۔

اقبال ایک ناصح تھا ــــ جس نے اپنی قوم کے ہر فرد بشر کو نصیحتوں سے مستفید کیا۔ غلامی کی زندگی بسر کرنے سے روکا۔ اور دنیا میں زندہ قوموں کی طرح رہنے کی تلقین فرمائی۔

اقبال ایک مصلح تھا ــــ جس نے اپنی صدائے نوازیۂ اور نوا ورد انگیز سے اپنی قوم کی اصلاح کی۔ جس نے مسلمانوں کو اپنی پستی اور گمراہی کا احساس دلایا اور ان کے دلوں میں جوشِ عمل پیدا کیا۔

اقبال ایک فلسفی تھا ــــ جس کے فلسفیانہ خیالات نے اُسے راہِ مستقیم پر چلنے

کی رہنمائی فرمائی - اور جس نے اپنے فلسفہ سے انسانیت کے بے بہا رموز منکشف کئے۔

اقبال ایک ڈاکٹر تھا — جس نے اپنی قوتِ نبض شناسی سے مسلمانوں کی تمام بیماریاں معلوم کیں - اور انہیں شفایاب ہونے کے لئے بے حد مجرب نسخے اور علاج بتائے۔

اقبال ایک بیرسٹر تھا — جس کا قانون صرف قرآن تھا اور شریعتِ محمدیؐ اسے فوجداری اور دیوانی مقدمات کی پیروی کی ضرورت نہیں تھی - بلکہ اس نے صرف مسلمانوں کی زبون حالی - افلاس اور تنزلی کی اپیلیں درگاہ رب العزت اور دربار محمدیؐ میں بصد عجز و نیاز پیش کیں۔

اقبال ایک سچا مسلمان تھا — جس نے پیغمبر اسلام کی تعلیم پر عمل کیا۔

اقبال ایک خوددار انسان تھا — جس نے مسلمانوں کو خودی کی تعلیم دی اور غلامی اور محکومیت کی آہنی کڑیوں سے آزاد ہونے کا سبق دیا۔

اقبال ایک مؤرخ تھا — جس نے عہدِ کہن کی عظمت و بلندی کے منظر پیش کئے۔ اور بزرگوں کے کارناموں کی یاد دلائی - تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں جوشِ عمل موجزن ہو۔

اقبال ایک ہادی تھا — جس نے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو راہِ راست دکھائی، اور اپنا کلام بطور مشعلِ ہدایت پیش کیا۔

اقبال ایک صوفی تھا — جس نے اپنے خانۂ دل کو نورانی تجلیات سے منور کیا۔ شرابِ معرفت سے مخموری حاصل کی۔ اور قدرتی نغموں سے متأثر ہوا۔

اقبال ایک غمخوارِ ملت تھا — جس کے دل میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور تنزلی خار بن کر کھٹکتی تھی۔

اقبال ایک مصوّر تھا — جس نے اپنے جذبات - احساسات اور تخیلات کی تصویریں الفاظوں اور فقروں میں اپنی قوم کے سامنے پیش کیں تاکہ مسلمان اپنی اصلیت اور حقیقت سے باخبر ہوں۔

اقبال ایک متبحر عالم تھا — جس کے سینہ میں علوم و فنون کے سمندر موجزن تھے

اقبال ایک سالارِ قوم تھا — جسے ہمیشہ اپنی قوم کی فتح و نصرت کا خیال رہا۔

اقبال ایک لیڈر تھا — جس کے دل میں — ع مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا کا جذبہ موجزن تھا۔

اقبال ایک مسیحا تھا — جس نے اپنی قوم کو اپنے سوزِ نفس سے نئی زندگی بخشی۔

آہ! — اقبالؒ! — تو ہر فن مولا تھا۔ واقعی ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ایڈیٹر
نخلستانِ ادب

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے — نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے — تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ — نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟ — میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو؟

محسن کی یاد

(از حضرت افتخارِ سخن افسوسؔ انصاری)

مندرجہ ذیل نظم کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے میں چند تمہیدی الفاظ کا تحریر کرنا لازمی گردانتا ہوں۔

یہ نظم علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے جان فرسا سانحۂ ارتحال کے وقوع پذیر ہونے سے تھوڑے ہی عرصہ بعد لکھی گئی ہے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر ایک حصہ سولہ اشعار پر مشتمل ہے۔ پہلے دو حصے مجلۂ "گلستانِ ادب" کے شمارۂ موجودہ میں طبع ہو رہے ہیں۔ اس نظم کی تالیف کا مقصدِ وحید علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے اُن گرانبہا خیالات کا اجمالی تحفظ ہے۔ جو عہدِ حاضر کے ہندی مسلمان کی قومی اصلاح سے وابستہ ہیں مطالب ضروریہ کی ترتیب اس اسلوب پر کی گئی ہے۔ کہ نظم کے پہلے حصے میں اس بدیہی اصول کو تسلیم کرتے ہوئے کہ صحیح قوانینِ اسلام مسلمانوں کی قومی اور سیاسی اور اجتماعی اور مذہبی شعوبِ زندگی میں یکساں اور پورے فائدے کے ساتھ عمل میں لائے جاسکتے ہیں اُن قومی اور مذہبی کمزوریوں اور کجرویوں کو مختصر طور پر قلمبند کیا گیا ہے۔ جو مرورِ ایام کے ساتھ ہماری ہیئتِ اجتماعی کی تخریب و تذلیل کا باعث ہوئی ہیں۔ اور ہو رہی ہیں۔ اور جن سے علامہ موصوف علیہ الرحمۃ کی نکتہ رس نگاہوں کے کامل تجسس اور حقیقت نگار قلم کی پُرمعنی تحریروں نے ہمیں اچھی طرح روشناس کرایا ہے۔ اور نظم کے دوسرے حصے میں اُس "دانائے راز" اور "خود آگاہ" فقیرِ خدامست کا غیر مکمل طریق پر تعارف کرایا گیا ہے جس نے اپنی مردہ قوم کے سرہانے الہامی آواز میں مسیحائی انداز کے ساتھ نعرۂ قُم بلند کیا۔ اس حصے میں "اقبالؒ کی کہانی اس کی اپنی زبانی" کا التزام رکھا گیا ہے۔ نظم کے تیسرے اور آخری حصے میں علامہ موصوف علیہ الرحمۃ کے لطیف ترین تخیل کی "حسین مخلوق" کے نازک خدوخال کا سرسری طور پر خاکہ کھینچا گیا ہے۔ یعنی یہ اُس مومن مسلمان کی مدھم سی تصویر ہے۔ جو اسلامی تمدن و تہذیب۔ اور شان و تمکنت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اور جس کی مانند علامہ موصوف علیہ الرحمۃ ہمیں یعنی اسلام کی نژادِ نو کو دیکھنا چاہتے تھے۔

مذکورہ بالا بحث کے علاوہ اگر نظم کو خالص ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نقاد طبع قارئین کرام اپنی خردہ بیں نگاہوں کی وساطت سے فوراً بھانپ لیں گے۔ کہ اشعار میں ندرتِ فکر۔ جدتِ تخیل۔ رنگینیٔ الفاظ۔ نفاستِ بیان۔ ذاتی تجربات کا اظہار۔ مختصر یہ کہ کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی۔ جو انہیں نویسندہ کے شاعر ہونے کا اقرار کرا سکے۔ میں اُن سے عرض کرتا ہوں کہ میں انہیں اپنے "ان کے لئے" شاعر ہونے کا قائل کرانا چاہتا ہی نہیں۔ نظم کی تالیف کا مقصد تو ان پر ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظم اُن کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنی ذاتی یادداشت کے لئے لکھی گئی تھی۔ جواب مجلہ ہذا کے مہربان "ایڈیٹر" کے مخلصانہ اصرار کی وجہ سے انہیں دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔ اور انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے۔ کہ انسانی زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ خارجی یا اجتماعی! اور داخلی یا انفرادی! تصویر کا خارجی رُخ صرف عوام کی نگاہوں کو دعوتِ دیدار دیتا ہے۔ اور تصویر کا داخلی رُخ صرف مصور یا صاحب تصویر کے لئے ہوتا ہے۔ جو لمحاتِ تنہائی میں اس کی بیقرار روح کو تسکین پہنچاتا ہے۔ سو اُن کے لئے میں بی اے کا طالب علم ہو سکتا ہوں "انقلابی سوشلسٹ" ہو سکتا ہوں "تخلص باز" ہو سکتا ہوں۔ لیکن شاعر صرف اپنے اور اپنے لئے ہوں۔ اور اپنے علاوہ کسی دوسرے کے لئے ہرگز نہیں۔ اور باوجود اس اعتراف کے بھی اگر میرے اشعار طباعت پذیر ہوتے ہیں۔ تو اس کے لئے میرے گناہ کو نہیں بلکہ مہربان ایڈیٹر کی عنایتوں کو اپنی نظرِ التفات کی آماجگاہ قرار دیں۔ فقط

افسونؔ انصاری۔

محسن کی یاد

(۱)

مدت ہوئی جب تھے مرے افکار بھی اوہام
اور میری نگہ چشمِ جہاں میں تھی ابھی خام
کہنے کو مسلمان کے گھر پیدا ہوا تھا
پر مجھ کو نہ تھا علم کہ کیا چیز ہے اسلام
تعلیم میری صاحبِ تثلیث کی تعلیم
توحید بھی آزادیٔ دلِ صاحبِ اصنام

تھی ترکِ جہاں کی مرے قرآن میں تعلیم
تھا اس میں غلامی کے مسائل کا بھی ارقام
مذہب کو سمجھتا تھا میں مُلا کی خرافات
تھا راہِ ترقی میں میری موجبِ آلام
تقدیر مری ناقضِ احکامِ خدا تھی
مجبور تھا میں صورتِ مرغانِ تہِ دام

تھا میرا عمل زیورِ تحقیق سے عاری
دیتا تھا میں محکومی و تقلید کا پیغام
تھا دل کو مرے ہستیٔ معبود سے انکار
سجدوں کا میں مسجد میں بہت کرتا تھا ابرام
قسمت میں جو تھی تان اُڑانے میں مہارت
تھیں میری اذانیں ہی میری رازق و قسام
تکبیر بھی اُس سوز بلالی سے تھی محروم
جس سوز سے جاتے تھے پگھل مصر کے اہرام
تھا ولولۂ شوق گراں طبع پہ میری
اور قاطعِ برہانِ خدا تھا میرا الہام
تھی موت میرے واسطے کب تحفۂ خدا کا[1]
مرجاتی اگر چیونٹی لرز جاتا تھا اندام
جس فقر[2] پہ تھا فخر امیرِ دوجہاں کو
اس سے ہوسِ زر کا نہ ہوسکتا تھا اتمام
القصہ نظر میری سمجھتی تھی اُسے خوب
ناخوب سمجھتا تھا جسے ہادیٔ اقوام
اسلام مٹے یا کہ رہے میری بلا سے
ناموسِ فرنگی کا تحفظ تھا میرا کام
آخر مجھے اک مردِ قلندر نے جگایا
افسوس مجھے اپنے پہ خود رحم نہ آیا
وہ مردِ خدا مست نگہ جس کی تھی بیباک
تھا جس پہ عیاں سترِ سرا پردۂ افلاک
"رکھتا تھا نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند"
اللہ نے بخشا جسے اندیشۂ چالاک
فطرت کا خدا بند فرشتوں کی نظر میں
یزداں کی قبا جس کے جنوں سے تھی کبھی چاک
غفلت زدہ اُمت پہ تھی اللہ کی لاٹھی
جس صاحبِ ادراک کا بیرنگ تھا ادراک
اک غمزے میں کہہ جاتا تھا وحدت کے سب اسرار
حاصل تھا ازل ہی سے جسے دیدۂ نمناک
"گھر اُس کا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند"
مومن کو سمجھتا تھا فقط صاحبِ لولاک
اُٹھ جاتیں اگر سوئے فلک جس کی نگاہیں
ہوجاتی تھی مجبورِ سکوں گردشِ افلاک
فطرت نے جسے پیدا غلاموں میں کیا تھا
اور مسلمِ ہندی نے جسے رکھا تھا غمناک
خاکی تھا مگر خاک میں تھی طاقتِ پرواز
وہ خاک کہ گم جس میں تھی پہنائیٔ افلاک
وہ خاک تڑپ جس نے فرشتوں کو عطا کی
"وہ خاک کہ جبریل کی تھی جس سے قبا چاک"
وہ خاک کہ کونین میں تھا زلزلہ جس سے
"وہ خاک کہ تھا جس کا جنوں صیقلِ ادراک"
"وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہ تھی جس کو"
"چنتی نہ تھی پہنائے چمن سے خس و خاشاک"
"وہ خاک کہ تجھ نے جسے یزداں نے وہ آنسو"
"گرتی تھی چمک جن کی ستاروں کو عرقناک"
رومی نے عطا کی تھی جسے برقِ تجلی
تھا دیرکہن جس کی نظر میں خس و خاشاک
"پرسوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار"
جس مردِ خود آگاہ کے تھے قلب و نظر پاک
اُس مردِ خود آگہ نے کیا رازِ خودی فاش
شہباز نظر گشت مرا دیدۂ خفاش

آفسون انصاری بی اے

(۱) الموت تحفۃ المومن) حدیث (۲) الفقر فخری) حدیث

علامہ اقبالؒ

(ایک مسلمان سوشلسٹ کی نظر میں)

اس سے پیشتر کہ شاعری کی دوربین نگاہوں کا کشتہ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام بلاغت نظام پر اپنے جذبات وجد کو حرکت میں لاتے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ ہمارا سوشلزم اسلامی سوشلزم ہے۔ اور ہم علامہ مرحوم و مغفور کو اسی عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں:-

پیشرو اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیائے فرعونیت کے سامنے جو مسلک پیش کیا۔ وہ عین قانونِ فطرت کے مطابق اور اصول مدنیت کے موافق تھا اور ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرورِ ایام سے نفس پرستوں نے ان اصولوں کو مسخ کر دیا۔ لیکن معمولی سے تفکر سے حقیقت اپنا جلوہ دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ خود حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مقدس زندگی اور پھر اس کے بعد صحابہ کرام کے طریق بود و ماند اور خصوصیت کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ حضرت فاروق اعظم رضؓ حضرت علی رضؓ خیبر شکن، حضرت عثمان غنی رضؓ۔ حضرت ابوذر غفاری رضؓ۔ اور بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سوشل زندگی کے مجسم نمونے تھے، مگر یہ سوشلزم اس سوشلزم سے بہت اعلیٰ و ارفع تھا۔ جو روس کے احمقوں نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ وہ مشکل کے وقت کسی ایسی قوت کے سامنے اپنی درخواست پیش کرے جس کو عالم کے ہر جز و کل پر قدرت حاصل ہو اور اس کو بدیہی طور پر یقین ہو کہ وہ اس کی فریاد کو سُن کر دادرسی کرنے پر قادر ہے۔ یہی وہ ذات پاک ہے جس کے تصور سے سوسائٹی کا نظام درہم برہم نہیں ہونے پاتا۔ اور اسی قیام نظام کے سبب انسان۔ لفظ انسان سے تخاطب کا مستحق ہے ورنہ بہائم اور اشرف المخلوقات میں کوئی وجہ امتیاز باقی نہیں رہتی۔ اسلامی سوشلزم نے اسی مقدس تصور کو اپنے پیروؤں کے قلوب و دماغ میں پیوست کر دیا۔

ہمارے ملک کا مایۂ ناز ہیرو شاعر اسی سوشلزم کا علمبردار ہے۔ اور چلا چلا کر اسی مبارک مقصد کی تبلیغ کرتا ہے۔ ہمارے قومی سپوت کے ایک ایک لفظ میں اسی قسم کا رس بھرا ہوا ہے۔ ابتدائی کلام سے لے کر آخری کلام تک میں اسی نور کی جھلک نظر آتی ہے مثال کے طور پر میں یہاں ایک نہایت واضح شعر پیش کرتا ہوں۔

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

بال جبرئیل میں علامہ مرحوم نے متذکرہ بالا شعر خداوند قدوس کے فرمان کی صورت میں پیش فرمایا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اونچے طبقے کے لوگ اس کو ایک معمولی شعر تصور کریں۔ مگر میں اپنی نسبت تو یہ عرض کرونگا کہ جس وقت بھی یہ شعر میری نظر کے سامنے آتا ہے میری روح رقص کرنے لگتی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ کشمکش پر نظر کیجیے مزدور اور سرمایہ دار کی حالت دیکھیے۔ اور خاص طور پر اس غریب کسان کا جائزہ لیجیے۔ جو قصر حکومت کی بنیاد ہے۔ یہ سب کچھ دیکھیے۔ اور گہری نظر سے دیکھیے .... اور پھر اس کے بعد شاعر کا اعجاز ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ اکبر شاعر کہتا ہے ع اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو۔ "ہر خوشۂ گندم" پر کس قدر زور پڑ رہا ہے۔ روزی کا میسر نہ ہونا اور خوشۂ گندم کا جلایا جانا واللہ تشریحات کی دنیا اس میں مضمر ہے۔

جہاں تک علامہ اقبال کے کلام سے مجھے واقفیت ہے۔ اور جس قدر محدود مطالعہ میں کر چکا ہوں اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں۔ کہ علامہ مرحوم نے جس عنوان پر گہر افشانی فرمائی ہے اسلامی سوشلزم کے گوہر آبدار اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ فلسفہ اور تصوف کچھ اس طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو چکے ہیں۔ کہ چولی دامن کا ساتھ کہا جائے تو بہتر ہے۔ یونانی فلسفے نے تصوف کی ہیئت کو بدلا زرتشتی اثرات نے اس کو چار چاند لگائے اور ہندوستان کے جوگیانہ تخیل نے اس پر صیقل کر کے اسلامی مسلک سے اس کو کوسوں دور لے جا ڈالا۔ علامہ مرحوم مغفور نے ایک نباض طبیب کی طرح اس دکھتی رگ کو پکڑا اور قوم کی پستی کا روگ معلوم کر کے چھوڑا۔ اور صرف یہی نہیں کہ راز معلوم کیا بلکہ اس کا علاج بھی کیا۔ جس وقت ہم علامہ مرحوم کے تصوف کو دیکھتے ہیں۔ تو ہم پر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ اس حکیم و فلسفی نے کس طرح صوفیانہ انداز و تخیل کی دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔ اہل تصوف کے نزدیک اپنی ہستی کو

کو فنا کرکے محبوب کی ہستی میں بقا حاصل کرنے کے مسلک کا نام تصوّف تھا۔ علامہؒ نے اس غلطی کو پہچان کر بتایا۔ کہ یہ مسلک اسلام کا مسلک نہیں ہے، اسلام کہتا ہے کہ اپنی ہستی کو پہچان کر محبوب تک پہنچو۔ قدیم مسلک نے جبن، بے عملی اور بددلی سے عوام کو روشناس کرکے ان کی روحِ اسلامی کو سلب کرلیا تھا۔ علامہ مرحوم نے خدا کی پہچان سے اسلامی نظریہ کو چمکا کر پیش کیا۔ اور یہی وہ نظریہ ہے جس کے ذریعہ مسلمان صدیوں دنیا پر چھائے رہے۔ اسلام رہبانیت کا طرفدار نہیں وہ اپنے سپاہیوں کو سوشل زندگی سکھاتا ہے۔ اسلام میں چونکہ حکومت کا مالک صرف خدا ہے۔ اس لئے وہ آمر کو مطلق العنان اور مامور کو مظلوم و بیکس دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اسلام کے اصول کے مطابق انسان کو خلافتِ خداوندی تفویض ہوتی ہے۔ اور وہ بھی کسی ایک "لینن" یا اس کی پارٹی کو نہیں بلکہ اس اصول کے ماننے والوں میں سے ہر شخص کو بغیر کسی امتیاز کے پہنچتی ہے، روسی سوشلزم میں عوام اپنے حقِ حکومت اور حق قانون سازی کو چند افراد کے سپرد کرکے اصولی طور پر ان کے غلام ہو جاتے ہیں۔ اور اسلامی سوشلزم میں حکومت کرنے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کا تھا جس کی تکمیل ہو چکی۔ اب اس قانون کو نافذ کرنے کا حق ہر اس متنفّس کو ہے جو اس کو ماننے والا ہے۔ قانون کو وضع کرنے اور اس کے منوانے کا مسئلہ تو سرے ہی سے ختم ہو گیا یہ تو ہر شخص کو لامحالہ ماننا پڑے گا۔ اور اگر کوئی شخص اس کے کسی جزو یا کل کا منکر ہے۔ تو اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو وہ ابتدا سے مانتا ہی نہ تھا۔ یا ابتدا سے مانتا تھا لیکن بعد میں منکر ہوا۔ پہلی صورت کفر کی ہے۔ اور ایسا شخص اس جماعت سے باہر ہے۔ اور دوسری صورت بغاوت ہے۔ اور باغی کی سزا قتل ہے۔

مندرجہ بالا سطور اسلامی سوشلزم اور روسی سوشلزم کا فرق مختصراً بیان کیا گیا ہے — چونکہ میں یہ کہنا چاہتا تھا۔ کہ علامہ مرحوم و مغفور نے بالِ جبریل میں جو "فرمانِ خدا" کے عنوان سے نظم لکھی اور جس کا شعر میں اوپر پیش کر آیا ہوں۔ وہ سوشل تخیل کا ایک کھلا ہوا نمونہ ہے۔ اس لئے ضرورت پیش آئی کہ اسلامی سوشلزم کی حکومت کا تصوّر محدود الفاظ میں پیش کردوں۔

علامہ مرحوم "فرمانِ خدا" میں فرشتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

موجودہ زمانہ میں جبکہ ہر چہار جانب سے بھوکے اور مفلس مزدور کے چیخنے چلانے کی حوصلہ شکن آوازیں چلی آ رہی ہیں۔ کون نہیں جانتا۔ کہ مزدور اور سرمایہ دار ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مذہب اسلام کے ہادی اوّل صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت عالم امکان میں قدم رکھا تو قصر کسریٰ کے کنگرے گر پڑے تھے۔ وہ فخر موجودات سرورِ کائنات علیہ التحیہ والتسلیم کسی سرمایہ دار گھرانے کے چشم و چراغ نہ تھے۔ بلکہ ایک غریب اور بیوہ ماں کے سپوت تھے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ حضور کے اس ارشادِ گرامی میں کہ "اسلام غریبوں میں آیا اور ہمیشہ غریبوں میں رہیگا" کچھ اسی قسم کا راز مضمر ہے۔ اب ذرا واقعات اور حقائق کو ذہن میں رکھ کر پھر اس شعر کو دیکھئے۔ اور بیٹھے سر دُھنا کیجے۔

اللہ اللہ شاعر کا قلم۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

اب پھر ذرا تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھئے۔ عرب کے وہ مٹھی بھر وحشی کہلانے والے انسان سوزِ یقین سے گرما کر بیک وقت فارس و روم کی جبروتی قوتوں سے کس طرح ٹکر لیتے ہیں۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ تاریخ عالم اس قسم کی ایک ادنےٰ سی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ وہ شیطان کے بندے بتوں کے غلام سوزِ یقین سے گرما کر انسانیت کے مکمل مجسمے اور دنیا کی تہذیب و تمدن کے مالک بن جاتے ہیں۔ اب لوٹ کر پھر غلام ہندوستان میں آ جیے۔ اور یہاں کے کسی گوشے میں کھڑے ہو کر اس شعر کی تکرار کئے جائیے۔ سبحان اللہ کیا کیف ہے۔ دوبارہ اس شعر کو پیش کرتا ہوں۔

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

اگرچہ اس شعر کی کیفیتیں دامنِ خیال کو الجھائے لیتی ہیں لیکن میں دوسرا خوب تر شعر پیش کرتا ہوں۔ اس گھونٹ میں اس سے زیادہ لذت ہے فرماتے ہیں۔

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

دیکھئے "سلطانیٔ جمہور" اور "نقشِ کہن" دونوں ٹکڑے شعر کی روح ہیں۔ مگر ان سے کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیگا۔ یہاں "سلطانیٔ جمہور" سے صرف حق خلافت

الٰہی مقصود و منظور رہے مسلمان سلطان خواہ فرد واحد ہو یا ایک جماعت بہر صورت دنیا میں قانون الٰہی رواج دینے پر مامور ہوتا ہے۔ اور اسی لئے "مامور من اللہ" کہا گیا ہے۔ اس کو اصول و قانون کی تبدیلی کا ذرہ برابر حق حاصل نہیں ہے۔ "نقش کہن" وہ نقش کہن ہیں۔ جو اسلام نے آج سے تیرہ سو برس پہلے قائم کئے تھے۔ نہیں نہیں دیکھئے یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ یہ نقش کہن وہ ہیں جن کو مٹا کر اسلام نے اپنے حسین اور تازہ نقش قائم کئے تھے۔ شاعر کی محقق نظریں قوم کے موجودہ نظام و ترتیب یا بدنظمی و بے ترتیبی میں انہی نقوش کہن کو جلوہ گر دیکھتا ہے۔ اور اسی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس چند الفاظ کے مجموعے میں قومی درس پنہاں ہے۔

اس منزل میں پہنچکر شاعر کے سامنے چونکہ حقائق کے پردے کھلے ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کی روح غیض و غضب کا مرقع بن جاتی ہے۔ علامہ رح فرماتے ہیں۔

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
"پیرانِ کلیسا" کو کلیسا سے اٹھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو

سب کچھ کہہ لینے کے بعد شاعر کے قلب کو اس خیال سے بے چینی ہوئی کہ شاید میری قوم کے کج فہم غلام میری اس تڑپ کو نہ پا سکیں۔ اسی لئے آخر میں تہذیب نوی کا پول کھول کر یہ جتلا دیا۔ کہ "آداب جنوں" کے حصول کے بعد ہی ایک قوم زندہ ہو سکتی ہے۔ اور یہ مفہوم علامہ رح کا بنیادی مفہوم ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

میرا مطالعہ محدود ضرور ہے۔ اور اسی بنا پر میں اچھی طرح کھل کر علامہ مرحوم مغفور

کے متعلق اپنے والہانہ جذبات کی ترجمانی بھی نہیں کر سکا ہوں مگر اس پر بھی جس قدر میری پہنچ ہے۔ اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں۔ کہ ہندوستان میں عموماً اور ملک پنجاب میں خصوصاً آج جو کچھ تڑپ اور بے چینی۔ احساس خودداری۔ اور غلامی کی بے حسی کے درمیان جو کچھ کش مکش نظر آ رہی ہے۔ یہ سب کچھ مشرق کے مایۂ ناز سپوت کی "بے نوازی" کا چلتا ہوا جادو ہے۔ اے کاش یہ بے نواز ملک کے گوشے گوشے میں بذات خود اپنی صور پھونکتا۔

میرا ایمان ہے کہ اگر ہندوستان ایک خوش قسمت ملک ہوتا۔ اور یہ اسلام کا سچا پرستار۔ سرزمین وطن کا سقراط۔ اپنی حجازی لے میں ہندی نغمے اہل وطن کے کانوں تک خود پہنچاتا۔ تو یہ غلامی کی زنجیریں کبھی کی ٹوٹ چکی ہوتیں۔ فقط۔

شمس الحسن صدیقی اختر

یہ شکایت نہیں ہیں اُن کے خزانے معمور　　نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور　　اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات کیا ہے کہ وہ پہلی سی مدارات نہیں

کیا کہا؟ بہر مسلماں ہے فقط وعدۂ حور　　شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور　　مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

(اقبالؒ)

ڈاکٹر سر محمدؐ اقبال

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ نطق نے بوسے میری زباں کیلئے

دانائے راز مفکرِ اعظم حکیم الملت علامہ محمدؐ اقبال دنیا کی اس ناقابل فراموش اور عالمگیر ہستی کے مالک تھے۔ کہ جن کی شاعری کا آفتابِ مقبولیت قلمرو صحافت پر تا ابد درخشاں و فروزاں رہیگا۔ آپ ہمارے خزاں دیدہ چمن آنے والے قافلہ بہار کے طائرِ پیش رس تھے، کہ جس کی صدائے جانفزا سے گل پژمردہ ہیں حیات تازہ کے آنے کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اگرچہ آج وہ طائرِ نغمہ سنج دنیائے فانی سے پرواز کر کے حیات ابدی بسر کرنے چلا گیا ہے مگر اُس کی وہ دلکش وہ دلفریب آواز جو رونے میں بھی خوش نوائی کا سامان مہیا کر کے ہمیشہ یہی کہتے سُنائی دیتی تھی کہ ؎

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں ہر درد مند دل کو رونا مرا رُلا دے
یا
جاگنے والے اسی بانگ درا سے دل ہوں بے ہوش جو پڑے ہیں شاید اُنہیں جگا دے

اب بھی قوم خفتہ کو پیغام بیداری دینے میں مشغول ہے۔

علامہ موصوف میں خداوندِ سمیع و بصیر نے وہ تمام اوصافِ حمیدہ کہ جو اُنہیں بام ترقی پر لے جانے میں ممد و معاون رہے ودیعت کئے تھے۔ آپ شعرائے قدیم کی تمام صفات کا ایک مجموعہ تھے اور شاعری میں ؎

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے جن کی فیضِ طبع نے اردو کو گنج زر دیا
ایک وضع میں بڑھ گیا اک رفعت تخیل میں تیسرے کی ذات میں دونو کو حق نے بھر دیا
کائنات شاعری میں ہیں بس یہی دونو کمال تیسرے میں اس لئے دونو کو یکجا کر دیا

آپ یگانۂ روزگار ہونے کے علاوہ بزرگان سلف سے بھی بازی لے گئے ہیں ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

آپ کی یہ فضیلت و خصوصیت بآسانی آپ کے دست تصرف میں نہیں آئی کیونکہ مرزا غالب کا یہ فرمانا کہ تیر۔ غالب اور اقبال کی طرف اشارہ ہے ۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حقیقت پر مبنی ہے پھر جہاں بینی سے دشوار ترین کام کا ہاتھ میں لے لینا اور اس پر قابو پانا ایک امرِ محال ہے۔ اقبال خود اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؎

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

ان اوامر میں کامیابی حاصل کر لینا ہر کسی کے اپنے بس کی بات نہیں خدائے قدوس جسے چاہے برتری عطا فرمائے اور جسے چاہے قعرِ مذلت میں غرقاب کر دے ، انہوں نے خود ہی فرما دیا ہے　　　وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست　　　گر نہ بخشد خدائے بخشندہ

مگر تجربہ شاہد ہے کہ ایسی شخصیتوں کا عالم وجود میں آنے کے لئے کافی عرصہ درکار ہوتا ہے۔ علامہ کی نظر حقیقت شناس اس مسئلہ کو خوب سمجھتی تھی ۔ آپ نے دُنیا کو بھی ایسے مسئلہ سے روشناس کر دیا ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بلکہ اس سے بھی زیادہ صاف اور پُر زور الفاظ میں فرما دیا کہ ؎

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ مے نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بیروں

سال ۱۹۳۸ء اسلام کے لئے ایک فالِ نحس تھا ۔ اسی سال اس عالمگیر مذہب کی تین مقتدر رہنمائے قوم شخصیتیں جو صحیح معنوں میں اس کا کمال ۔ اقبال اور شوکت تھیں ۔ اس دارِ فانی سے عالمِ بقا کی طرف کوچ کر گئیں مگر اُن کے کارہائے نمایاں دوسروں کے لئے خضرِ راہ بن کر قوم کی رہبری کرنے میں مصروف بہ عمل ہیں ۔ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے ۔ اور یہ پس ماندگان کے صبرِ جمیل کا ہی نتیجہ ہے ۔ کہ اب بھی ظفر ملت ۔ آزاد اور جناح قائدانِ اسلام جیسی راہنمایانِ قوم شخصیتیں کشتیٔ ملت کو قعرِ جہالت سے دھکیل کر ساحلِ کامرانی کی طرف لے جانے میں کوشاں نظر آتی ہیں اور وہ دن دور معلوم نہیں ہوتا

جبکہ اسلام خزاں دیدہ چمن نفاق کے سموم اور تند جھونکوں سے بچکر اتحاد کی ہوائے بہار کا پرتپاک خیر مقدم کرے - ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ زندگی - پیغام - جادہ حیات اور فلسفہ خودی کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں وہ خود ہی عالم بے خودی میں اس قدر کھوئے گئے ہیں کہ اپنے متعلق کچھ بتانے کے قابل ہی نہیں رہے - ارشاد ہوتا ہے ؎

گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت پیدا نہیں کچھ اس سے تصور ہمہ دانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

مگر اس کے باوجود بعض کوتاہ بیں اور نکتہ چیں اصحاب اقبال کے کلام کو محدود کرتے ہوئے اسے ایک مذہبی شاعر سے زیادہ وقعت دینے میں دریغ نہیں کرتے - وہ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں - کہ اقبال نے جو کچھ بھی کہا وہ اپنے مذہب کی خاطر کہا اور جو کچھ بھی کیا وہ اپنے مذہب کے لئے کیا - مگر اصلیت کو سمجھنے سے قاصر رہے - شاعر گرامی جو بقول خود ؎

در دیدہ معنی نگراں حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیغمبر نتواں گفت

کے مفہوم کے آئینہ دار تھے - اپنی زباں سے یوں گویا ہوتے ہیں ؎

چوں رخت خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند کہ با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت با کہ گفت و از کجا بود

ان حالات کے درمیان اقبال کو ایک طرف متوجہ ہوتے کہنا سراسر غلط فہمی کی دلیل ہے - اگر انہوں نے کچھ اپنی قوم یعنی مسلم سے کچھ کہا تو اس لئے کہ ان میں اس کے سمجھنے کی اوروں سے زیادہ صلاحیت تھی - ورنہ تمام اقوام عالم آپ کے کلام سے یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکتی ہیں ، آپ ایک عالمگیر شاعر تھے جو کسی خاص فرقہ سے تعلق خصوصی رکھنے میں احتراز کرتے تھے ؎

مجموعہ اضداد ہے اقبال نہیں ہے دل دفتر حکمت ہے طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی

مگر ان حالات کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ نکتہ چیں اصحاب کسی پر نکتہ چینی کرنے سے نہیں رہتے - اور وہ کسی ایک چیز کی متفق الکلمہ ہو کر اچھائی بیان نہ کرنے کے مقولہ پر

عمل پیرا ہوتے ہیں ؎

غالبؔ بُرا نہ مان گر واعظ بُرا کہے ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

اقبال پر اعتراض نہ کرنا اُن کے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کے مترادف ہوتا۔ چنانچہ جب ڈاکٹر صاحب کو "سر" کا اعزازی خطاب ملا۔ تو لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ ایسا شخص جو ملوکیت کا دشمن اور جمہوریت و آزادی کا علمبردار ہو۔ اب سرکاری ہتھکنڈوں میں کیسے پھنس کر رہ گیا۔ چنانچہ آپ کو یہاں تک بھی کہہ دیا گیا ؎

لو مدرسہ علم ہوا قصرِ حکومت افسوس کہ علامہ سے سر ہو گئے اقبال
پہلے تو سرِ ملتِ بیضا کے بنے تاج اب اور سنو تاج کے سر ہو گئے اقبال
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال

مگر دنیا نے دیکھ لیا۔ کہ ان اعتراضات و طنزیات سے ڈاکٹر صاحب کے کان پر جوں تک کو بھی نہ رینگنے دیا۔ بلکہ قومی خدمت کرنے میں مصروف بہ کار رہے،

خزاں میں بھی کب آسکتا تھا میں صیاد کی زد میں میری غماز تھی شاخِ نشیمن کی کم اوراقی
الٹ جائینگی تدبیریں بدل جائینگی تقدیریں حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

نکتہ چینیوں کی پرواہ تک نہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

بُرا سمجھوں اُنہیں مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

یہی مصرعہ تھا جو اُنہیں اپنے لائحہ عمل میں مستعد رکھنے میں اُن کا معاون رہا۔ چنانچہ آپ نے اقوامِ عالم کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ اور ان کے اذہان پر اس طرح قبضہ کیا۔ کہ وہ آپ کی وفات حسرت آیات پر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ چنانچہ ملک کے دو برگزیدہ اربابِ علم کے آپ کی وفات پر اظہارِ تاسف کا بیان نمونتاً نقل کر دینا بے جا نہ ہوگا۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور فرماتے ہیں "سر محمد اقبال کی موت نے ہماری ادبیات میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا ہے۔ جو ایک مہلک زخم سے مشابہت رکھتا ہے اور جس کے پُر ہونے کے لئے مدتِ مدید درکار ہے۔ ہندوستان کا رتبہ دنیا میں بے حد محدود اور تنگ ہے اس لئے ایک ایسے شاعر کی موت کا صدمہ جس کی شاعری عالمگیر اہمیت رکھتی ہے۔ ملک کے لئے ناقابل برداشت ہے"

رئیس الاحرار مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی نے بھی آپ کی نوحہ خوانی کی۔
علامہ کے فرزند خورد جاوید اقبال کے نام تعزیت نامہ میں فرماتے ہیں " آج کے اخباروں میں اقبال مرحوم کے انتقال پُر ملال کا حال پڑھ کر جس قدر صدمہ ہوا اس کا اظہار بذریعہ الفاظ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اپریل ۳۷ء میں بیگم حسرت کا انتقال ہوا تھا۔ اس سانحہ ہوشربا کے بعد فقیر کا دل مشغلہ شعر و سخن سے سرد ہو چکا تھا۔ کہ اب اقبال کے حادثہ عظیم نے بیدلی و افسردہ مزاجی کی تکمیل کر دی"
مندرجہ ذیل پانچ اشعار بھی اقبال کی نوحہ خوانی میں لکھے :-

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر | آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
کاروبار شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں | دل پہ ذوق شاعری اک بار ہے تیرے بغیر
شرکت بزم سخن سے بھی نہیں یاد صف عزم | بر بنائے بیدلی انکار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے بغیر | اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر

دردِ دل جو تھا کبھی وجہ مباہات و شرف
بہر حسرت موجب صد عار ہے تیرے بغیر

آپ کے عقیدت مند اصحاب کے نزدیک آپ کی قدر و منزلت کچھ اور ہے۔ آپ کو ایک مذہبی شاعر کے سوائے اور کوئی رتبہ نہ دینا اپنی تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے علامہ نے جو کچھ کہا۔ وہ عوام کے فائدہ کے لئے کہا۔ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہر کہ و مہ اس سے یکساں طور پر بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید و الفرقان حمید دنیا کی ایک ایسی عالمگیر کتاب ہے کہ جو خالق کون و مکان کی طرف سے اُس کی مخلوق ہر دوسرا کے مفادِ عامہ کے لئے نازل ہوئی۔ اور انہیں صراط المستقیم کے دکھانے کا بہترین ذریعہ۔ مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اقبال اپنی آخری عمر تک سوائے قرآن کے اور کوئی کتاب سامنے نہ رکھتے تھے مولانا ابو الاعلیٰ یوں تحریر فرماتے ہیں کہ " سالہا سال تک علوم و فنون کے دفتروں میں غرق رہنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے تھے۔ وہ یہ تھا کہ اصل علم قرآن ہے۔ اور یہ جس کے ہاتھ آجائے۔ وہ دنیا کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان کے پاس فلسفہ کے چند اہم سوالات بھیجے۔ اور ان کا جواب مانگا۔ ان کے قریب رہنے والے لوگ متوقع تھے۔ کہ اب علامہ اپنی لائبریری کی الماریاں کھلوائیں گے ـــــ بڑی بڑی کتابیں نکلوا کر ان

سائل کے سوالات کا حل تلاش کرینگے مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ لائبریری کی الماریاں مقفل کی مقفل پڑی رہ گئیں۔ اور وہ صرف قرآن حکیم ہاتھ میں لیکر جواب لکھوانے بیٹھ گئے۔"

آپ کے کلام کا بیشتر حصہ قرآن حکیم کے فرمودات کی تفسیر ہے۔ آپ کو قرآن کریم کے تمام حقائق و دیگر مسائل پر پورا عبور تھا۔ آپ قوم کے تمام نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہ تھے

قوم کیا چیز ہے قوم کی امامت کیا ہے		اس کو کیا سمجھیں یہ دو رکعت کے امام

آپ نے اسلام کی خدمت کر کے دیگر اقوام عالم کو اپنا لائحہ عمل تلاش کرنے کو اکسایا اور دنیا پر اس بات کو خاص طور پر ظاہر کر دیا۔ کہ ان کی مذہبی شاعری میں تمام مذاہب کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ اسی طور پر آپ نے مذہب کی وہ خدمت کی۔ کہ جو صدیوں تک شائد کسی سے ادا ہو۔ اور کرتے بھی کیوں نہ ایک فرمانبردار اور سعادت مند بیٹے سے اپنے والد کے نصائح پر عمل نہ کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔ کہ علامہ موصوف نے سفر کابل کے دوران میں مجھے اپنی زندگی کے دو واقعے بیان کئے فرمایا کہ ایک دن میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ کہ والد بزرگوار وظائف سے فارغ ہو کر میرے پاس سے گزرے اور کہا کہ کبھی فرصت ملی تو تمہیں ایک بات بتاؤنگا کئی دفعہ کے تقاضا کرنے کے بعد آخر ایک دن پھر جب میں قرآن شریف کی تلاوت کر رہا تھا کہ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ اور فرمایا کہ بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے۔ اور اللہ تعالٰے خود تم ہی سے ہمکلام ہے" یہ فقرہ میرے دل میں اتر گیا۔ اور اس کی لذت دل میں اب تک محسوس کرتا ہوں۔

دوسرا واقعہ اس طرح بیان کیا کہ باپ نے بیٹے سے اپنی تمام محنت صرف شدہ کا معاوضہ چاہا۔ لائق بیٹے نے سرِ تسلیم خم کیا۔ اور پوچھا وہ کیا ہے کہا کسی موقع پر بتاؤنگا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ بیٹا میری محبت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا چنانچہ باپ جب بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے تھے تو بیٹے نے کہ جس کی مذہبی خدمت اس کی شاعری کے پیام سے ادا ہو چکی تھی۔ باپ سے پوچھا کہ آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں۔ باپ نے بسترِ مرگ پر شہادت دی کہ جان من تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے اقبالؒ نے ساری عمر جو پیام دنیا کو سنایا وہ

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے کھو گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ

مگر قوم کی پامالی کی وجہ کیا ہے آپس میں اختلاف۔ خلوص نہ ہونے کی وجہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

تمدن۔ تصوف۔ شریعت کلام بتان عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ اُمت روایات میں کھو گئی

مولانا حالی نے بھی قوم کی زبوں حالی کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر گریہ زاری کی۔ آپ نے قوم کو ایک مرض میں مبتلا پایا۔ ایسے مہلک مرض کو دیکھ کر آپ کی آنکھوں سے بیساختہ آنسو رواں ہو گئے۔ تو آپ نے مرثیہ خوانی کی ٹھانی۔ اس نوحہ خوانی میں صرف اس بات کا اظہار کیا۔ کہ قوم کس پامالی اور بربادی کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ مگر ایسے ایسے پیچیدہ جال سے نکالنے کی تدبیر نہ سوچی۔ آپ نے قوم کی پامالی کے مہلک مرض کی تشخیص تو کی مگر کوئی ایسا کارگر نسخہ تجویز نہ فرمایا کہ جس سے قریب المرگ مریض جانبر ہو سکے۔ اسی طرح سرسید جیسے دوسرے مذہبی لیڈر بھی عالم وجود میں آتے رہے۔ مگر ہماری آنکھوں نے دیکھا کہ وہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" اصول پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرماتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ مرض نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ اس نے مریض کے تمام اعضائے رئیسہ کو کمزور اور اس کی روح کو مضمحل کر کے رکھ دیا۔ مگر درماں کے بتانے والے حکیم کا پیدا ہونا قوم بیمار کی خوش بختی کا جاگ اُٹھنا تھا۔ تو زمانہ نے دیکھ لیا۔ کہ حکیم الملت علامہ نے حکمائے قدیم کی طرح مرض کی تشخیص بھی نہایت غور و خوض کے ساتھ فرمائی اور اس کے لئے وہ نسخہ ایجاد فرمایا کہ جس کی پہلی خوراک کے پینے سے مریض کی حالت کا بہتر ہونا اور جان مردہ میں زندگی کی لہر دوڑ جانے کی اُمید قوی ہو گئی۔

اصل بات جو ہمارے پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے وہ کونسا نسخہ تجویز فرمایا کہ جس کی ادویات کو حاصل کر کے ہم جلد مرض مہلک سے نجات حاصل کریں ایک دانائے راز کے رموز و اسرار کو سمجھنے کے لئے بھی دانائی کی ضرورت ہوتی ہے مبادا اشیاء کی کمی یا بیشی سے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سے

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ڈاکٹر صاحب نے کئی ایک بیانات سے ہمیں چھٹکارے کی تجویز بہم پہنچائی کہ جن پر تفصیل سے بحث کرنا مضمون کو غیر معمولی طوالت دینا ہے اور ساتھ ہی نخلستان میں بھی جگہ نہ ملنے کا احتمال ہے۔ لہذا چند ایک رموز کو نہایت ہی مختصر طور پر بیان کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔

بعض اصحاب کے نزدیک مسئلہ خودی سے مراد تکبر۔ کبر و نخوت ہے مگر یہ سراسر غلطی پر مبنی ہے۔ خودی سے مراد خودداری ہے۔ اور اگر ذرا زیادہ توجہ سے سمجھا جاوے تو عمل کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ عاجزی۔ غلامی اور انکساری جیسے رذیل ترین فعل کو فعل بد قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اپنے پاؤں پر چلنے کا سبق دیا گیا ہے۔ اپنے اندر وہ جوہر پیدا کرنے کا زور دیا گیا ہے۔ کہ جس پر زمانہ عش عش کر اُٹھے۔ تمام زمانہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ جس طرف چاہے اُسے موڑ دے۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کا صلہ ضرور ملتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

کسی کی منت و زاری سے کام نکلوانا شیروں کا کام نہیں بلکہ ایسا فعل لومڑیوں سے سرزد ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

تو اگر خوددار ہے منت کش ساقی نہ ہو　　عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

فرماتے ہیں اگر انسان چاہے تو اپنے نیک اعمال کے ذریعہ خدا سے ہر بات کے منوانے کا حق رکھتا ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

انسان میں خداوند قدوس نے وہ طاقت ودیعت کی ہے کہ وہ تمام مشاہیر عالم سے بھی گوئے سبقت لے جا سکتا ہے مگر کیسے؟ اپنے اعمال و افعال کے ذریعے ؎

ہزار چشمہ تیرے سنگ راہ سے پھوٹے　　خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

آپ کے اسی مسئلہ پر میں زیادہ زور دینا ضروری نہیں سمجھتا۔ مسئلہ خودی کو آسان اور عام فہم طریقہ پر صاف الفاظ میں واضح کر دیا ہے مسٹر شہید نے بھی اپنے مضمون میں اس کے سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے۔ اب صرف آپ کا پیغام بہ مسلم کہ جب وہ ہمیشہ مرد مومن بننے کی نصیحت کرتے رہے ہیں۔ چند سطور میں بیان کیا جائیگا۔ یہی ایک سب سے اعلیٰ وجہ ہے۔ جو مرد مسلمان کو دست غیر سے چھڑا کر اُسے آزادی کا سبق پڑھاتا

ہے۔ اُسے بیہوشی سے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسے مرض مہلک سے چھٹکارہ دلانے میں مصروف ہوتا ہے۔ اس کے فزاں دیدہ چمن میں آمدِ بہار کا پیش خیمہ ہے۔ اُسے حالتِ مدہوشی سے پیغام بیداری دیتا ہے۔ غرضیکہ یہ اُس کی ہر چیز میں کامیابی کا سربستہ راز ہے۔ مردِ مومن کی تعریف یوں فرمائی ہے:۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان　　گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اسے پہچاننے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے　　مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مومن کی آزادی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اُسے فرائض پابندی سے بھی آگاہ فرماتے ہیں:۔

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے　　مومن کا مقام ہر کہیں ہے

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات　　مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

مومن کو ہمت و استقلال میں جوانمرد بننے کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

دنیا کے نظم و نسق میں انسان کا بڑا ہاتھ ہے۔ خالقِ موجودات نے اسے اس لئے تخلیق کیا ہے کہ وہ اپنے مساعی جمیلہ سے دنیا میں نیرنگیاں پھیلا دے۔ بنانے والے کو اپنی بنائی ہوئی چیز سے بہت پیار ہوتا ہے۔ مخلوق جس طرف چلنے کی کوشش کریگی، خالق اکبر بھی اسی طرف اس کی امداد فرمائیں گے۔ آپ مردِ مسلمان سے حسب ذیل پیغام پر زور الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے　　یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی　　ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا　　خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا　　تیری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

محبانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر　　نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

پس ہم نے دیکھ لیا۔ کہ اقبال نے کس قدر قوم کی خدمت کی اور جس قدر جذبہ مذہبیت سے آپ سرشار تھے۔ آپ نے کس طرح اپنے والد بزرگوار کی نصیحت پر عمل کر کے دنیائے اسلام کی خدمت کی ہے آپ کا پیغام تمام اقوام عالم کیلئے درس حیات ہے۔ جس سے ہر کس وناکس یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ہم بجا طور پر اقبال رح کو شاعری کا پیغمبر کہہ سکتے ہیں — کیونکہ ؎

در دیدۂ معنی ے نگراں حضرت اقبال
پیغمبری کردہ و پیغمبر نتواں گفت

نور محمد علوی بی اے۔
متعلم ایم اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

کلام اقبال رح

اقبال رح کے چند چیدہ اشعار آپ کے غور و فکر کے لئے پیش کئے جاتے ہیں:۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر (؟)

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اقبالؒ

[از جناب ڈاکٹر خواجہ ایف - ایم شجاع صاحب منعمیؔ]

(ایم - اے - ایم - ایس سی - ایچ پی - پی ایچ - ڈی)

فصلِ گل ہیں صفحۂ ہستی ہے تصویرِ بہار ذرّہ ذرّہ ہے نشاط و حُسن کا آئینہ دار
جب خزاں آئی نہیں جس پر کسی کو اختیار خامشی کا دور ہے ساری فضا ہے سوگوار
لیکن اے اقبال جس گلشن کا تُو ہے پاسباں
ایک حُسنِ لافنا ہے اک بہارِ جاوداں

چشمِ بینا پر ہویدا، خیر و شر کا راز ہے راز دارِ مُرغ و ماہی ہے فلک پرواز ہے
تو تھا چشمِ قوم تجھ پر راز کا دَر باز ہے تیری حکمت شعر کے قالب ہیں اک اعجاز ہے
دیکھ تو آکر تیری فرقت میں ہے کیا حال آج
نم ہے چشمِ قوم تیرے غم میں اے اقبال آج

بادۂ دردِ تمنّا سے بھرے دل کے ایاغ آتشیں پیغام سے شمس و قمر سینے کے داغ
لالہ و گُل سوز سے تیرے درخشاں ہیں چراغ تیرے نغموں سے دبستان بن گئے ہیں باغ و راغ
پیکرِ خاکی ہیں شعلہ زار پیدا کر دیا
فیضِ صحبت نے تیری قطروں کو دریا کر دیا

تو نے قوموں کو بتائی رمزِ تعبیرِ حیات زندگی تفسیرِ رازِ حرب و ضرب کائنات
زندگی میں نوشِ سم ہے نیشِ حُریّت نبات خوابِ رنگینِ غلامانِ حکمراں کے مسکرات
عالمِ اسلام معروفِ عمل پھر ہو گیا
بیج آزادی کا تو مشرق کے دل میں بو گیا

منعمیؔ

فلسفۂ حیات

افلاطون

"جُز نام[1] نہیں صورت عالم مجھے منظور جُز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے"

شوپنہار

ہر تار نفس اُلجھا ہُوا خار الم سے اک وادیٔ پُر خار ہے دنیا مرے آگے

خیام

ہر چند ہے آلام پہ انسان کی بنیاد تم رکھ دو مگر ساغر و صہبا مرے آگے

برگساں

ہر روز نئے رنگ بدلتا ہے زمانہ ہوتا ہے نیا روز تماشا مرے آگے

اقبالؒ

انساں ہے فقط ہستیٔ دانا و توانا جُز اس کے ہر اک چیز ہے عنقا مرے آگے

[1] یہ شعر غالب کا ہے۔

محمد نواز شہید بی اے فائنل
(اڈیٹر نخلستان ادب (انگریزی سیکشن)

اقبال ـــــــ فلاسفر اور شاعر

شاعر اندر سینۂ ملّت چو دل ملّتے بے شاعرے انبارِ گل
از درونِ ایں گلے بے حاصلے بس غنیمت دان اگر دیدِ دلے (اقبالؔ)

شعراء کی مقبولیت:۔ کسی شاعر کی مقبولیت عام طور پر تین طریقوں سے ہوتی ہے۔ اوّلاً اگر وہ کسی نئی طرز کا موجد ہے یا اس کا کلام فلسفیانہ اور حکیمانہ نکات اور نہایت دقیق علمی و اخلاقی مسائل کا مجموعہ ہے یا اگر اس کی شاعری ایک خاص پیغام کی حامل ہے۔ تو عوام بہ نسبت خواص اس کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہی توجہ بڑھتے بڑھتے تقلید کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بعد میں عوام بھی تقلیداً اپنے مذاق کو صحیح اور شُستہ ثابت کرنے کے لئے اس کے معتقد ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ تمام ملک اسی شعلے کی لپیٹ میں آ جاتا ہے ہندوستان میں اس کی بہترین مثال مرزا غالب ہیں جو اپنے زمانے میں اتنے مقبول نہیں ہوئے جتنا کہ بعد میں ہوئے ہیں۔

ثانیاً بادشاہ وقت سے دوستی، حکومت میں اثر و رسوخ اور شاگردوں کا پروپیگنڈا بھی شاعر کو کافی مشہور کر دیتا ہے لیکن ایسی شہرت اور مقبولیت دیرپا ثابت نہیں ہوتی حاسدوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہے اور لوگ قدرتی طور پر اس سے متنفّر ہو جاتے ہیں اس طرح اس کا کلام خواہ وہ دوسرے شاعروں کے کلام سے جو اسی صنف سخن میں طبع آزمائی کر گئے ہیں کسی پہلو بھی کم درجے کا نہ ہو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ خاقانی ہند ذوق دہلوی بھی اسی قاعدے کی رُو سے بعد میں زیادہ مقبول نہیں ہو سکے۔

ثالثاً شاعری میں مذاقِ وقت کی مطابقت۔ شاعر کو عوام میں بہت مقبول بنا دیتی ہے اگرچہ وہ عموماً پبلک کے سامنے وہی چیز پیش کرتا ہے جو پہلے پیش کی جا چکی ہوتی ہے لیکن اس کی طرزِ ادا نئی اور شان نرالی ہوتی ہے۔ اسی مشق کے دوران میں وہ اس فن میں خاص مہارت حاصل کر لیتا ہے اور آخر کار وہ اس صنفِ سخن کو جس میں وہ ہمیشہ طبع آزمائی کرتا

آیا ہے معراج پر پہنچا دیتا ہے۔ عوام تو پہلے ہی سے گرویدہ ہوتے ہیں اب خواص پر بھی اثر پڑتا ہے کیونکہ وہ عوام سے الگ تھلگ تو رہ نہیں سکتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بھی یہی عوام ہوتے ہیں جو رفتہ رفتہ نام پیدا کر کے خواص کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں اسی طرح ملک کا تقریباً ہر فرد اس کے کمال کا معترف ہو جاتا ہے۔

کلام اقبال :- لیکن اقبال کی مقبولیت کسی خاص طریقے کے ماتحت نہیں ہوئی اس کے مضامین کی ہمہ گیری اور کلام کے زور نے خواص و عام دونوں کو بیک وقت موہ لیا ہے جس طرح ایک اندھا بھی پھول کو ہاتھ میں لے کر اور سونگھ کر یہ بتا سکتا ہے کہ یہ نرم و ملائم ہے اور خوشبودار بھی اسی طرح عوام بھی اس کے شعر کی اصلیت اور معانی سے کچھ نہ کچھ ضرور آگاہ ہو جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ جس طرح اندھا پھول کے رنگ کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ وہ بھی یہ نہ بتا سکیں کہ اس میں فنی خوبی کیا ہے ورنہ اس کا کلام تو بانگِ درا ہے جس کو سن کر قافلے کا ہر شخص خواہ وہ امیر ہے یا غریب۔ دیوانہ ہے یا فرزانہ منزل پر پہنچنے کے لئے نہایت بیتابی کے ساتھ تیاری کر رہا ہے۔ ایک آب جو ہے جو یا تو حقیقت کے بحر بیکراں سے ہمکنار ہو چکی ہے یا بیکنار کر دی گئی ہے۔ خواص کو اس میں سے گوہر زندگی ہاتھ آتا ہے۔ عوام اس سے ظاہری صفائی یعنی اخلاق و عادات کی درستی کا کام لیتے ہیں۔ ایک ساز ہے جس سے مختلف نغمات پیدا ہوتے ہیں اور جس کا بجانے والا ان نغمات کے سوز و درد میں تحلیل ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک تصویر ہے جو اس خوبی سے کھینچی گئی ہے کہ اس کے دونوں رُخ نمایاں ہو گئے ہیں بعض اُسے دیکھ کر رو دیتے ہیں اور بعض بے پروائی سے ہنسنے لگ جاتے ہیں۔

اقبال کا تخیّل :- عربی میں ایک مقولہ ہے الشعراء تلامیذ الرحمٰن یعنی شاعر خدا کے شاگرد ہوتے ہیں۔ مختلف حضرات نے اسے مختلف طریقوں سے ثابت کیا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فقرے میں شعرائے کرام کی نسبت واقعی مبالغے سے کام لیا گیا ہے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے کیونکہ ملک کے ان ہونہار سپوتوں کی قوتِ تخیل ایک ایسی چیز ہے جو نئے نئے مضامین پیدا کرتی ہے عجیب عجیب اور پُر اسرار حکمت نکات کو عالم وجود میں لاتی ہے اور ہمارے سامنے ایسے ایسے خیالات اور حقائق کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتی ہے جن کا بظاہر کوئی ماخذ معلوم نہیں ہوتا

اس قوت کا اندازہ کرنے کے لئے جب کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو سب سے پہلی چیز جس کی جستجو لازمی ہوتی ہے یہ ہے کہ اس نے کس حد تک ایسے مضامین پیدا کئے ہیں جن کا کوئی ماخذ نہیں یا جو کسی کی تقلید میں نہیں لکھے گئے۔ اور اگر تقلید میں لکھے بھی گئے ہیں تو اس شاہراہ سے الگ رہ کر یعنی صرف طریق بیان وہی ہے لیکن اس کے برعکس عقائد میں مخالفت۔ نظریے میں خاص فرق۔ خیالات میں جدت اور نتائج میں ندرت پائی جاتی ہے۔

اقبال نے بھی اسی قوتِ تخیل کی مدد سے اپنی شاعری کو اس درجے تک پہنچایا ہے۔ جہاں پہنچ کر شاعری پیغمبری کا ایک جزو بن جاتی ہے چنانچہ جب اس کی تصانیف پر نظر پڑتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تخیل کا ایک سمندر ہے جو لہریں لے رہا ہے سورج جیسے مختلف روشن کُرّے ہیں جن میں سے نور ہدایت کی کرنیں نکل نکل کر ہر غفلت کوش کو پیغام بیداری دے رہی ہے۔ سب سے پہلے اس کی اس شاعری کا مطالعہ کیجئے جو اس حالت میں لکھی گئی ہے جسے حضراتِ صوفیہ کی اصطلاح میں بقا کی حالت کہا جاتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں مالک عظمت و خودی کے نشے میں چور ہوتا ہے جو کچھ بھی اُس کے منہ میں آتا ہے بیباکی سے کہتا چلا جاتا ہے۔ بعض دفعہ تو خُدا سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے۔ جیسے کوئی فقیر شوخ کسی کو لپٹ جاتا ہے اور اپنی منہ مانگی لے کر ہی چھوڑتا ہے اور بعض دفعہ اس طرح۔ جیسے کوئی مردِ مجاہد کسی انصاف پرور امیر یا حاکم وقت سے اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہا ہو۔ چنانچہ بالِ جبریل میں یہ چیز بہت کچھ نمایاں ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے اقبال ٹیگور سے بازی لے جاتا ہے۔ کیونکہ ٹیگور ابھی فنا کی حالت میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ وہ اناہد شبد[1] کا متوالا نغمات پر تو جان دیتا ہے لیکن یا تو وہ بھی انہیں آوازوں پر قانع ہے یا اُسے آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی کیونکہ وہ شدید طور پر محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک کمزور

---

[1] اناہد شبد ایک قسم کا عمل ہے جس کی مشق کرکے ہندو یوگی اور بعض مسلمان فقیر اپنے خیال میں معرفت کو پا لیتے ہیں۔ یہ ایک اصطلاح ہے جو مختلف راگوں کے مجموعے کو الفاظ میں ظاہر کرنے کیلئے بنائی گئی ہے یہ راگ انسان کے سر سے نکلتے ہیں جو آنکھ کان اور منہ بند کرکے سنے جاتے ہیں چنانچہ مولانا روم بھی اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں ؎ چشم بند و گوش بند و لب ببند۔ گر نہ بینی نورِ حق بر ما بخند

اور ناتجربہ کار انسان ہے جس کا تخیل مادی دنیا کی حدود سے آگے نہیں نکل سکتا اور نکلے بھی کیسے؟ جب کہ اس کے پاس کوئی شمع ہدایت نہیں لیکن اس کے برعکس اقبال کے پاس قرآن ہے اور قصہ معراج ہے۔ وہ ان کی روشنی میں اس دنیا کی حدود سے کبھی کا نکل چکا ہے اور ہر وقت نئے جہان کی تلاش میں رہتا ہے۔

وسعت تخیل کا دوسرا ثبوت اس کی مثنویوں میں ملتا ہے جہاں اس نے اخلاقی نقطۂ نظر سے بعض آیات اور احادیث کی تشریحات منظوم کی ہیں یہی وہ چیزیں ہیں جن کو فلسفۂ مغرب کے مقابلے پر لایا جاسکتا ہے اور جو انشاء اللہ فلسفۂ اخلاق کے ضمن میں بالتفصیل بیان کردی جائیں گی۔ اس کے علاوہ وہ حکائیتیں بھی ہیں جن کے ضمن میں وہ ایسے ایسے نکات اور دقیق مسائل بیان کر جاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے نتائج اتنے اہم اور شاندار ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ ان کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح وہ نظمیں جو ابلیس کی زبانی لکھی گئی ہیں اور وہ جو بانگ درا کے اخیر میں ہیں بلندی تخیل کی بہت اعلیٰ مثالیں ہیں۔ بال جبریل میں جبریل اور ابلیس اور ارمغان حجاز میں ابلیس کی مجلس شوریٰ بالترتیب دنیا اور اس کی موجودگی کے اسباب پر روشنی ڈالتی ہوئی آخر میں سیاسیات حاضرہ کی قلعی اس طرح کھول دیتی ہیں کہ لیلائے مغرب کے رُخ سے تمام نقاب اٹھ جاتے ہیں اور جبیں پر جو تحریر دکھائی دیتی ہے وہ سوائے جوع الارض اور حکومت سرمایہ داری کے اور کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ اس نے مشرق و مغرب کی اور بھی کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس سے اقوام دنیا کو واسطہ نہ پڑتا ہو اور جس کو اس نے بے نقاب نہ کیا ہو۔ غرضیکہ اس نے اپنے مضامین میں اتنی ہمہ گیری پیدا کی اور اپنے تخیل کو اتنا وسیع کیا کہ تمام دنیا کو اس کے احاطہ میں لے لیا گویا اس کا تخیل کیا ہے ہوئے موج در موج جس میں اس کی دنیائے شاعری معلق ہے اور جس کی وجہ سے اُسے بقا حاصل ہے۔ اسی ہوا کی موجیں چمن میں آتی ہیں تو پھول کھلاتی جاتی ہیں۔ صحرا سے گزرتی ہیں تو ذرات ریگ کو اڑا اڑا کر دنیا کو وہاں کی حقیقت سے خبردار کرتی ہیں اور بتاتی جاتی ہیں کہ صحراؤں سے طوفان یوں اٹھا کرتے ہیں اور اس طرح تمام عالم پر چھا جایا کرتے ہیں پہاڑوں کی دلفریبیوں اور نظاروں میں محو نہیں ہوتیں بلکہ مرد کہستان کو خودی کا پیغام پہنچاتی ہیں مستی میں آتی ہیں تو سرے سے اسی شاخ کو ہی توڑ دیتی ہیں جس پر تہذیب جدید کا آشیانہ بنایا گیا ہے اور سیاسیات حاضرہ کی کشتی کو سیل بے پناہ کی آغوش کے حوالے کرتی ہیں۔ کبھی چاند کی غاروں کی

خبر لیتی ہیں کبھی مریخ کی وادیوں میں گھومتی پھرتی ہیں یہاں تک کہ ان مقاموں کو طے کرتی ہوئی جہاں تک کہ عقل کی رسائی ہو سکتی ہے۔ مقام شوق میں داخل ہوتی ہیں۔ اور ——— ایک آواز آتی ہے ۔ مقام عقل سے آساں گذر گیا اقبال ۔ مقام شوق میں کھویا گیا یہ فرزانہ

اقبال کا فلسفہ:۔ تخیل کے بعد دوسری چیز جو اقبال کی شاعری کی جان ہے اور جس پر اس کے پیام کا دار و مدار ہے وہ اس کا فلسفہ ہے جس کا وہ خود ہی موجد ہے ۔ اس نے اپنے تخیل کی مدد سے جس قدر بھی پھول کھلائے ہیں وہ اگرچہ مختلف ہیں لیکن بو ایک ہی رکھتے ہیں۔ اسی بُو کو جہاں تک اس کا گلہائے مضامین اقبال سے تعلق ہے ہم فلسفہ کے نام سے پکارتے ہیں یا یوں سمجھئے کہ وہ معنی صدف شعر میں پنہاں ہیں وہ اگرچہ حسب موقعہ سوز و مستی، خلوص و عقیدت اور عظمت و خودی کے مختلف رنگوں میں رنگے اور سجے ہوئے ہیں لیکن ان میں آب و تاب اور چمک دمک ایک ہی ہے اسی آب و تاب اور چمک دمک کا دوسرا نام جہاں تک اس کا کلام اقبال کے دریائے بے بہا سے تعلق ہے، فلسفہ ہے۔

فلسفۂ زندگی:۔ اقبال نے جس فلسفے پر بہت زور دیا ہے اور جس کی جزئیات پر بھی بخوبی بحث کی ہے وہ اس کا فلسفۂ حیات ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی ایک دریا ہے جو ہمیشہ بہتا رہتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے طوفانی ہوتا جاتا ہے انسان کا یہ کمال نہیں کہ اسی رَو پر ہی بہتا چلا جائے اور بے بس تنکے کی طرح اپنے آپ کو ان طوفانوں میں گھسنے اور بچ کر نکلنے کا خوگر بنائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو زندگی کا اہل بنائے اور اس طوفانی دریا میں جس طرف بھی منہ اٹھا کر نکلنا چاہئے نکل جائے۔ یہی شہ آزادی ہے اور یہی شان زندگی وہ افراد اور وہ قومیں جو ان طوفانوں میں گھبرا کر ٹھہر جاتی ہیں اکثر فنا ہو جایا کرتی ہیں۔ کامیابی دراصل اسی خواہش کا نام ہے جو ایک مقام پر پہنچ کر دوسرے مقام پر پہنچنے کے لئے ہوتی ہے اور ——— کائنات کے کسی ذرے کو ثبات نہیں وہ ہر وقت تڑپتا رہتا ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے اور زندگی کا اصول ——— بغیر تڑپ کے بھی زندگی ممکن نہیں کیونکہ تڑپ نہ ہوگی تو جوش اور ولولہ کیسے پیدا ہوگا اور جب جوش اور ولولہ نہ ہوگا تو زندگی کے طوفان سے مقابلہ کرنے کی ہمت ہی کیسے پیدا ہوگی۔ یہی چیز ہے جو مختلف موقعوں پر مختلف طریقوں سے دُہرائی

گئی ہے لیکن شاعر نے ہر دفعہ اس میں نئی آن پیدا کر دی ہے جہاں کہیں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات میں بات پیدا ہو گئی ہے اور یہی شاعر کا کمال ہے۔

فلسفۂ عشق:- اسی فلسفۂ زندگی کا ایک عنصر فلسفۂ عشق ہے۔ لیکن عشق بذاتِ خود زندگی کا عنصر نہیں بلکہ جوہر ہے۔ یہ جہان و مافیہا اسی کے دم سے ہی موجود ہے چنانچہ اس کو سمجھنے کے لئے فلسفۂ موجودہ کے "اصول تجاذبِ اجسام" کو ملاحظہ فرمائیے اس اصول کے ماتحت دنیا کی ہر چیز چھوٹے چھوٹے بے شمار ذرات کے اتحاد اور جذبِ باہمی کی وجہ سے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ دنیا مختصر طور پر دو حصوں میں منقسم کی جا سکتی ہے ایک حصہ خشکی ہے جس کو مٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرات نے مل کر ایک خاص صورت دے رکھی ہے اور دوسرا حصہ تری ہے جس کو پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرات نے مل کر بنا رکھا ہے اب رہا انسان سو وہ بھی اسی دنیا کی پیداوار ہے اور فطرتاً مدنی الطبع ہے۔ جب تک اس میں مل جل کر رہنے کی رغبت نہ پائی جائے وہ انسان نہیں رہ سکتا۔ اس طرح مل جل کر قومیں بنتی ہیں اور قومیں بغیر اتحاد اور جذبِ باہمی کے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ ہر چیز کی زندگی کا دار و مدار اس کے مختلف عناصر کے اتحاد اور جذبِ باہمی پر ہے یہی جذب بڑھ کر عشق بنتا ہے اور عشق بڑھتے بڑھتے جنون۔

یہی جذب، عشق اور جنون ہی وہ چیزیں ہیں جنہوں نے کئی معرکے سر کئے۔ جن کی مدد سے لاکھوں مشکلیں آسان ہو گئیں اور جو عقلِ انسانی کی رہبر بن کر کروڑوں موقعوں پر اس کے کام آئیں۔

فلسفۂ خودی:- اسی سلسلے کی تیسری کڑی فلسفۂ خودی ہے۔ خودی ایک ایسا لفظ ہے جس سے عام طور پر شاید تکبر کے معنی لئے جاتے ہیں یا کم از کم ایک ایسا جذبہ مراد لیا جاتا ہے جو تکبر کی طرف لے جاتا ہے لیکن اقبال کے ہاں اس سے کچھ اور مراد ہے۔ خودی اس کے نزدیک ایک جوہر ہے۔ اور جوہر بھی وہ جو عشق یعنی جوہرِ زندگی سے حاصل ہو اس کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ہم عطر کو لیتے ہیں یہ پھولوں کا جوہر ہے اور پھول جوہرِ ارضی کی بدولت وجود

میں آتے ہیں اس لحاظ سے جو تعلق عطر کا پھولوں سے ہے وہی تعلق خودی کا عشق سے ہے اور جو تعلق پھولوں کا جوہر ارضی سے ہے۔ وہی تعلق عشق کا زندگی سے ہے۔

خودی سے بڑھ کر انسانی عظمت کی محافظ اور کوئی شے نہیں اگر یہ زندہ ہے تو قوم اور اس کی عظمت زندہ ہے۔ لیکن اگر یہ مُردہ ہے تو قوم اور اس کی عظمت بھی مُردہ۔ اقبال کی خودی وہ چیز نہیں جو فرمانِ الٰہی کی تعمیل سے انکار کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی بلکہ اس کی خودی وہی ہے جو یزید کی بیعت سے انکار کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی (ملاحظہ فرمائیے تکبر اور خودی میں فرق) وہ تکبر تھا اور یہ خودی۔

خودی انسان کو اپنا مرتبہ دکھاتی ہے چنانچہ جب وہ یہ سوچتا ہے۔ کہ میں اشرف المخلوقات ہوں اور خالق و مخلوق کے درمیان ہے اس وقت وہ خودی کے نشے میں پورا سرشار ہوتا ہے چونکہ انسانیت کے لئے باعثِ ننگ و عار نہیں ہوتا بلکہ باعث فخر ہوتا ہے۔ اس حالت میں وہ اپنے آپ سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اس لئے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کا مصداق ہو کر وہ اپنے خدا کو بھی پہچانتا ہے یہ اور بات ہے کہ ما عرفناک حق معرفتک پکار اٹھے کیونکہ آخر مخلوق ہی تو ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مقام وہی ہوتا ہے جہاں بندہ اپنے رب کو پہچانتا ہے اور رب اپنے بندے پر عطیاتِ رحمت کی بارش کرتا ہے تو اس چیز سے انکار کی کوئی وجہ نہیں رہتی کہ اس کی تقدیر کے متعلق ؎

"خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے"

فلسفۂ رجائیت و فلسفۂ عمل

فلسفۂ زندگی کے ماتحت اور بھی بہت سی جزئیات پر بحث کی جا سکتی ہے لیکن سب سے ضروری چیز جس پر فلسفۂ زندگی جیسی عظیم الشان عمارت کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ اس کا فلسفۂ رجائیت و فلسفۂ عمل ہے۔ اقبال مایوس شاعر نہیں اور نہ ہی وہ دوسروں کو مایوس ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تو دنیا میں اگر کوئی شخص ایسا بھی ہے جسے مایوسی سے فائدہ پہنچتا ہے تو وہ شیطان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی مایوسی تو بجائے خود ایک ہی مقصدِ زندگی ہے اور ایک لحاظ سے تو وہ حق بجانب بھی ہے کیونکہ اس کی مایوسی ہی کی وجہ سے یہ "سوزِ درونِ کائنات" یعنی موجودہ عالم کی مشینری اپنا کام کر رہی ہے۔ یعنی جس طرح بجلی کی دو تاروں (مثبت اور منفی) کے

ملنے سے بجلی عالم وجود میں آتی ہے ٹھیک اسی طرح دنیا امید پر بھی قائم ہے اور نااُمیدی پر بھی۔ انسان اور شیطان، امید اور نااُمیدی کی ٹکر سے ہی ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ جن پر اس دنیا کو ایک عرصے تک بقا حاصل ہے جب ان دو میں سے ایک کا خاتمہ ہو جائے گا تو یہ دنیا بھی ختم ہو جائے گی۔

شیطان اگر آج لاتقنطو کے فرمان پر عمل پیرا ہو کر اپنی نجات کی اُمید کرنا شروع کر دے تو لازمی امر ہے کہ وہ انسان کو بہکانا بھی چھوڑ دیگا۔ اس طرح دنیا میں یہ ہنگامے ختم ہو جائیں گے اور دنیا بھی ختم کیونکہ یہی ہنگامے تو اس دنیا کی بقا کا باعث ہیں۔

دوسری طرف اگر انسان نااُمید ہو جائے تو اس کا مطلب بھی صاف ہے نہ دنیا میں کوئی کام رہے اور نہ کام کرنے والے نتیجے کے طور پر۔ موجودہ نظام زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا دارومدار ہی امید اور اس کے نتائج پر ہے ——— اُمید کی بھی دو قسمیں ہیں ان میں سے جو خطرناک ہے وہ یہ ہے کہ اگر دور سے کوئی ابر کا ٹکڑا آتا ہوا دکھائی دے تو بارش کی امید پر کھیت کو سینچنا بھی بند کر دیا جائے یا اگر ایک دن بیکار بیٹھے رہنے کے باوجود کچھ کھانے کو مل جائے تو اسی امید پر بے کار بیٹھا رہنا چاہئے کہ پھر بھی مولا ہی دیگا۔ اس اُمید سے نااُمیدی بھی اچھی۔ یہ اُمید اُسے درکار نہیں بلکہ اُسے تو عمل چاہئے کیونکہ عمل سے ہی زندگی بنتی ہے۔

انسان کیا ہے ایک محشر خیال، جذبات اور خواہشات کا پتلا۔ اگر اس کے خیالات میں اُمید کا عنصر غالب ہے تو لازمی امر ہے کہ اُسے اچھے اچھے کام کرنے کی خواہش ہوگی یا کم از کم ایسے جن سے اُس کی ذات کو کچھ نہ کچھ نفع ضرور پہنچیگا۔ اور اگر اس کے خیالات یاس کا پہلو لئے ہوئے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص انسانی ہٹ دھرمی پر قائم رہ کر نیک راستے کے برخلاف بُرے راستے پر چلے گا اور بُرے کام ہی کریگا یا سرے سے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہی رہیگا۔ لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ جیسی خواہش ہوگی۔ ویسے جذبات پیدا ہونگے اور جیسے جذبات ہونگے ویسا کام کرنے کو جی چاہے گا مثال کے طور پر جب ہمارا کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے دل چاہتا ہے تو مختلف تراکیب سوجھنے لگتی ہیں۔ اور جب کوئی ترکیب اچھی نظر آتی ہے تو اُمید پیدا ہوتی ہے۔ اب اُسی امید ہی کی بدولت پراگندہ خیالات ایک ہی مرکز پر جمع ہونے

ہیں اور انسان کی تمام دماغی اور ذہنی طاقتوں کا رجوع صرف اسی طرف ہو جاتا ہے جس کے لئے وہ خواہشمند ہوتا ہے اس کو عشق کہتے ہیں۔ عشق جب اپنے جوبن پہ آتا ہے تو انسان کی خودی نمودار ہوتی ہے۔ اور اُسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کیا کچھ کرسکتا ہے اور کس طرح اپنی من مانی خواہشات کو عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ اس طرح اس کے دل میں ایک قسم کا یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ اس یقین کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان میں عمل کی قوتیں بیدار ہوتی ہیں اور اس طریقے پر معمولی خیالات ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہوئے صرف زندگی کا جزو ہی نہیں بنتے بلکہ زندگی کی تصویر کو مختلف رنگ دے کر اُسے ہر رنگ میں دکھا سکتے ہیں۔

یہ ہیں زندگی کے مختلف ارتقائی منازل جن کو طے کر کے زندگی مکمل ہوتی ہے اور جن کو اقبال نے اپنی شاعری میں فرداً فرداً بخوبی واضح کر دیا ہے۔ انشاء اللہ کبھی آئندہ اس کے فلسفۂ تصوف۔ فلسفۂ اخلاق۔ فلسفۂ ایمان (جو احادیث کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے) اس کی قومی شاعری اور اس کی مزاحیہ نظموں پر بحث کی جائے گی۔

سید اختر منیر بی۔ اے۔ آنرز
سٹوڈنٹ

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملاں ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

نگہ پیدا کرے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

محبت خویشتن بینی محبت خویشتن داری
محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن۔ اپنا تو بن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

اقبال علیہ الرحمۃ

حضرتِ اقبال آں شاہنشہِ اقلیم شعر
واقفِ اسرارِ دین و صاحب قلب سلیم

آن حکیم آں مردِ حق آگاہ آں دانائے راز
آں امیرِ کارروان و آن فقیرِ بے گلیم

شاعر و غواص بحر زندگی و بحرِ عشق
فلسفی و شارحِ آیاتِ قرآن عظیم

در نگاہش آفتابِ لاالہ الاّ ہُو
در دماغش عقل حاضر در دلش عشق قدیم

سینہ اش تابندہ از انوار اسرار و رموز
در وجود او دلے آن لامکانے را حریم

داد پیغام عمل اقوام پس افتادہ را
کرد از تیغ خودی تہذیب مغرب را دونیم

در ید او بال جبریل و زبورے در بغل
نیست پیغمبر ولیکن ضرب او ضرب کلیم

اختر منیر

جذبۂ عمل اور علامہ اقبالؒ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
اقبالؒ

دنیا میں صرف عمل ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر ہماری زندگی کے بننے اور بگڑنے کا انحصار ہے۔ جنّت اور جہنّم ہمارے اعمالوں پر موقوف ہیں۔ اقبالؒ کے خیال کے مطابق اگر ہمارے اعمال نیک ہیں تو ہم مستحق جنّت ورنہ جہنّم۔ سچ پوچھئے تو فطرتاً انسان نہ نوری ہے اور نہ ناری۔ علامہ اقبال نے ہمیشہ پیغام عمل دیا۔ آپ کا عقیدہ تھا کہ جو مزا تگ و دو اور جدوجہد میں ہے وہ خود حصولِ مقصد میں بھی نہیں۔

دنیا میں رہ کر ہمارے دلوں میں ہزاروں امنگیں اور آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں لیکن جب تک جوش عمل نہیں۔ تمام آرزوئیں اور امنگیں خام اور خواب ہیں۔ ہر فرد جانتا ہے کہ حرکت میں برکت ہے۔ اگر ہم میدانِ عمل میں سعی و کوشش سے کام نہیں لیں گے تو دین و دنیا میں سرفرازی ناممکن ہے۔ کیونکہ ؎

نہیں زندگی سلسلہ روز و شب کا نہیں زندگی مستی و نیم خوابی!!
حیات است در آتش خود طپیدن خوش آں دم کہ ایں نکتہ را یا بی اقبالؒ

ہمارے روزانہ تجربات سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ جب تک مزدور صبح سے شام تک نہ کمائے۔ پیٹ بھر کھانا میسر نہیں۔ جب تک طالب علم سال بھر محنت و جانفشانی سے کام نہ کرے۔ امتحان میں کامیابی مشکل بلکہ ناممکن۔ جب تک کسان کھیت میں دن رات کام نہ کرے۔ آب و دانہ سے تنگ جب تک قومیں اپنے دلوں میں جذبۂ عمل پنہاں نہیں رکھتیں۔ راہ ترقی سے محروم۔ آخر وہ کیا اکسیر ہے جو مزدور کا پیٹ پالتے ہیں۔ طالب العلم کو کامیابی دلاتے ہیں۔ کسان کو مرفۃ الحال بناتے ہیں اور قوموں کو بام ترقی پر پہنچانے میں مدد دیتی ہے۔ وہ صرف قوتِ عمل اور جذبۂ عمل ہے۔ واقعی ؎

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا   اقبالؔ

ڈاکٹر اقبالؒ کے نقطۂ نگاہ سے دنیا میں صرف جانوروں کی طرح پیٹ پالنا اور صبح و شام یونہی بیکاری میں گذارتے رہنا انسانی زندگی کا نام نہیں۔ بلکہ اپنے زورِ عمل۔ اپنے جذبۂ عمل اور اپنے جوش عمل سے دنیا میں عظمت و بلندی پر پہنچنے کا نام زندگی ہے۔ جس طرح دنیا میں سر بلند اور ممتاز ہونے کے لئے کوشش اور عمل کی ضرورت ہے۔ اسی طرح رسولؐ اور خدا تک پہنچنا بھی ہمارے عمل پر مبنی ہے۔

موجودہ دور میں بھلا جن مسلمانوں کو نماز ادا کرنے کے لئے بوٹ کے تسمہ ڈھیلے کرنا بار گراں ہو۔ جن مسلمانوں کو روزہ رکھنے کے لئے بارہ گھنٹے سگریٹ اور حقہ سے جدائی باعث مصیبت ہو جن مسلمانوں کو (جو شیکسپیئر اور ورڈز ورتھ کی نظمیں مطالعہ کرنے میں منہمک رہتے ہیں) چند صفحات کلام مجید تلاوت کرنے کی فرصت نہ ہو۔

جن مسلمانوں کو حج کے لئے راستہ میں جہاز غرق ہونے سے سمندر میں ڈوب جانے کا خطرہ لاحق ہو۔

جن مسلمانوں کو عبادت کے مقابلہ میں رات کی نیند پیاری ہو۔

جن مسلمانوں کو خدمتِ خلق سے شان و شوکت۔ عزت و آبرو اور رتبہ و دبدبہ میں کمی واقع ہونے کا خدشہ ہو۔

جن مسلمانوں کو اپنی پستی کا ذرا بھر بھی احساس اور اپنی ترقی کا جذبہ تک نہ ہو۔ اس قوم کا خدا حافظ آہ! علامہ مرحوم کس دکھے دل سے فرماتے ہیں ؎

قلب میں سوز نہیں۔ روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں   اقبالؔ

یہی باتیں تو اقبال کے لئے باعث اضطراب بنیں۔ انہیں باتوں نے تو اقبال کو ابھارا۔ انہیں باتوں سے تو اقبال کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہوا۔ اقبال نے ہر پہلو سے اقوام عالم کو بغور دیکھا۔ مگر افسوس۔ دوسری قومیں تو میدانِ عمل میں گامزن دکھائی دیں لیکن اسے اپنی قوم کو
کس لئے؟

بے عمل بن جانے کی وجہ سے۔ جذبۂ عمل مفقود ہو جانے کی وجہ سے۔ جوشِ عمل سرد ہو جانے کی وجہ سے۔

آخر اس مردِ میدان نے اپنی سعی و کوشش سے خفتہ قوم کو بیدار کر کے پیغام عمل دیا۔ تاکہ عمل سے ہی دنیوی اور دنیاوی زندگی سدھارنے کے قابل بن سکے کیونکہ ؎

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام　　سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر　　وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

اقبالؒ کو بے عمل اور ناکارہ لوگوں سے سخت نفرت تھی۔ آپ کے لئے تو مصائب و تکالیف کی گھڑیاں موجبِ مسرت ہوتی تھیں۔ بے عمل زندگی کیا ہے؟ صرف ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنا ——— اور در در ٹھوکریں کھاتے پھرنا دنیا میں جو ولی اور قطب کہلائے۔ جو بہادر جنگجو مشہور ہوئے۔ جو عادل اور دانا کہلائے۔ کس کی بدولت؟ صرف عمل کی وجہ سے۔ اگر کوئی چیز انسان کی قدر و منزلت بڑھاتی ہے تو وہ صرف عمل ہے۔ جس سے انسان حقیقی معنوں میں انسان کہلانے کے قابل بن کر دین و دنیا میں سرخروئی حاصل کرتا ہے ؎

یہی آئینِ قدرت ہے۔ یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے　　اقبالؔ

موجودہ زمانہ میں سائنس کے کرشمے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہی سب کچھ بھی قوتِ عمل کا نتیجہ ہیں۔ ہر کام میں عمل کی ضرورت ہے۔ جب طبیعت میں جذبۂ عمل پیدا ہو جاتا ہے تو زندگی خود بخود اک نئی شان چاہتی ہے۔ پرانا مقولہ ہے کہ ؏

کسبِ کمال کُن کہ عزیزِ جہاں شوی

کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کمال کی یہ عظمت و بلندی حاصل ہو سکتی ہے؟ نہیں جب تک کہ قوتِ عمل نہ ہو۔ قوتِ عمل سے کیا نہیں ہو سکتا؟

دشت و بیاباں گلزار بن جاتے ہیں۔
دنیا میں عزت و آبرو کی زندگی میسر ہوتی ہے۔
غلامی کی آہنی کڑیوں سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔

گناہوں میں بسر کی ہوئی زندگی نیکی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

مردہ قومیں حیاتِ جاوداں حاصل کرتی ہیں۔

مگر اس وقت۔ جب ہر فرد و ملت میں جذبۂ عمل۔ جوشِ عمل اور قوتِ عمل ہو۔

واقعی۔ اے غفلت میں ڈوبے انسان ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے — اقبالؔ

عبدالخالق نیرّ

بی۔ اے سٹوڈنٹ (فائینل ایر)

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا — مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں — مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں — کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی — کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی — ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیباک

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا — یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے — جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر — یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر — اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ — بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

اقبالؒ

(علاّمہ جلال الدّین صاحب لبیدؔ توکّلی بہاولپوری کی نظر میں)

اے حکیمِ امتِ خیر الورے　　　اے طبیب حاذقِ امراضِ ما
مئے پرست مست صہبائی خودی　　　اے کلیم طور سینائی خودی
بالِ جبریل پر پرواز تو　　　رشک صد بانگ درای آواز تو
اے چراغ محفلِ اخلاف ما　　　نوحہ خوانِ سطوت اسلاف ما
واقفِ رمز و رموز بندگی　　　محرمِ سِرِّ نہانِ زندگی
اے ہزار نغمہ گوئی خوش بیاں　　　اے سراجِ ظلمت ہندوستاں
واقفِ سرِ حقیقت ایں چنیں　　　مادرگیتی نہ زاید بعد ازیں
اے مریدِ مرشدِ رومی نژاد　　　یا الٰہی مرقدت پُر نور باد
گو قضا اورا زما مستور کرد　　　گفتہ ہایش قلب مارا طور کرد
ساقی مہوش زمحفل شد بعید　　　قول او شد مقطع نظمِ لبیدؔ

"اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بر بست و چشم ما کشاد"　　　اقبالؔ

شیخ محمد یوسف
متعلم تھرڈ ایر کلاس

اقبال کا جذبہ وطنیت

علامہ موصوف نے جہاں ایک فلسفی اور مفکر اعظم کی حیثیت سے اپنی ملت کو تمام رموز و اسرار سے آگاہ کرنے کی کوشش کی وہاں انہیں اخوت اور وطنیت جیسے مسائل کا حل بھی چند لفظوں میں بتا دیتے ہیں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ یہی دو چیزیں اقوام عالم کی ترقی میں صحیح طور پر رہنمائی کر سکتی ہیں۔ بعض اصحاب کا یہ کہنا کہ جذبۂ وطنیت امن عالم کا دشمن ہے، بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ اسی سے ہی اپنے بھائیوں کے لئے تعصب۔ بغض اور حسد کی آگ بھڑکتی ہے اخوت جو تمام اقوام کے لئے ایک لابدی امر ہے بیک نظر مفقود ہونا شروع ہو جاتی ہے چنانچہ ڈاکٹر صاحب اسی پر زور دیتے ہوئے آپس میں اخوت کی تلقین کرتے ہیں:-

اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
ہوس نے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو

تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی

شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر

جذبۂ وطنیت ایک غلط اور بے بنیاد نظریہ ہے۔ اسی سے ہماری اخوت اور آپس کے پریم و اخلاص کو وہ صدمہ پہنچتا ہے کہ جس کا کفارہ ناممکن ہے۔ اقبال نے وطنیت کے اس پیچیدہ مسئلے کو بالائے طاق ہی رکھا۔ آپ اپنے آپ کو ایک طائر آزاد سمجھتے ہیں کہ جہاں جی چاہے اڑے اور جہاں بھی بسیرا کرے اُسے اپنا وطن تصور کرے کیونکہ ؎

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

آپ کی نظر آزاد کسی ایک علاقہ پر نہیں جمتی۔ انہوں نے اپنا تعلق دنیا کے ہر گوشہ سے ملا رکھا ہے۔ کسی ایک مقام کو خصوصیت کے ساتھ اپنا کہنا انہیں بالکل ناپسند ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندہ حق بین حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندہ مومن ہوں نہیں دانہ اسپند

پُر سوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر خند

آزادی وطن کے سلسلہ میں سپین کے ساحل پر طارق کا وہ واقعہ یاد دلاتے ہیں کہ جب اس کے ہمراہیوں نے اُسے تمام کشتیوں کو جلاتے دیکھا تو دوری وطن میں ان کا دل اپنے خویش واقارب کے لئے اس قدر بھر آیا کہ انہوں نے فوراً گھبرا کر اُس سے ایسی نازیبا اور خلاف عقل حرکت کے سبب کا استفسار کیا۔ تو طارق فوراً مردانہ وار جواب میں اپنی ذہانت خداداد کی مدد سے حب الوطنی کے ذوق کو ان کے دل سے دور کر دیا ؎

طارق چوں بر کنار اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بنگاہ خرد خطا ست

دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم
ترک سبب از روئے شریعت کجا روا ست

خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ما ست

تمام دنیا کو اپنا وطن قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

آپ کی نظروں میں وطن کا زہریلا تخیل ایک خار ہے جس کو وہ ہر وقت نکالنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ مقامی قید ہی انسانی آزادی کے راستہ میں زبردست رکاوٹ ہے جو بحر آزادی میں ایک چٹان کی طرح حائل ہو کر کشتی جدوجہد کو اپنے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش کر دیتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ہم ہر مقامی قیود سے آزاد ہیں ہم جہاں چاہیں ہجرت کر کے چلے جائیں وہی ہمارا مسکن و وطن ہوگا۔ قید مقامی ہمیں بربادی کی طرف رہبری کرنے میں معاون ہوگی ؎

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی ہے

از زمانہ قدیم میں وطنیت کا مسئلہ بالکل مفقود نظر آتا ہے۔ مگر زمانہ موجودہ نے جہاں

اور مسائل میں ترقی کی وہاں مسئلہ وطنیت کو پس پشت نہیں ڈالا بلکہ یہ نادر ایجاد دور حاضری کی کوتاہ بینی کا نتیجہ ہے کہ وطنیت یا حب الوطنی نے اس کی آزادی میں حائل ہونے کی جرأت کرلی ہے

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور　　ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مگر بزرگان سلف کا نظریہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ "وطن" کے لفظ کو بھی اپنی جدو جہد میں شامل کرنے سے احتراز کرتے تھے ہم دیکھتے ہیں کہ

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

(علامہ موصوف کی نظر دور بین اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ کامیاب رہی کہ وطنیت کی پست خیالی ہی امن عالم خراب کرنے کی ذمہ دار ہوگی چنانچہ آپ مسئلہ مذکورہ کی نہایت پرجوش اور پرزور الفاظ میں تردید کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسرار خودی میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم　　چوں نگاہ نور دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما　　شبنم یک صبح خندانیم ما
ست چشم ساقی بطحاستیم　　در جہان
امتیازات　　پاک سوخت
آتش او این خس و خاشاک سوخت

یہاں قدرتی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ ممدوح نے تو خود بھی کئی دفعہ وطن سے اپنی الفت ظاہر کی۔ اور اسی طرح کئی دوسرے رہبران قوم و ملت بھی عوام کو حب الوطنی کے پیدا کرنے کی طرف ابھارتے رہے ہیں۔ خود علامہ نے بھی سطور ذیل میں اپنے وطن کی طرف محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی بڑائی بیان کی ہے

(کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے　　اسی باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ازل سے ملی ہے ہمیں ارم کی جائداد　　جو وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

اور کئی دفعہ آپ قومی گیت کو الاپتے وقت یہی کہتے سنائی دیئے کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

مگر اس کا جواب بھی ڈاکٹر صاحب نے خود "جاوید نامہ" میں مندرجہ ذیل الفاظ میں فرمادیا لکھتے ہیں ؎

آں کفِ خاکے کہ نامیدی وطن | ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہلِ وطن را نسبتے است | زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است
اندریں نسبت اگر داری نظر | نکتہ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق برآید آفتاب | با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوز دروں | تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں

فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است

ساتھ ہی یہ مثال پیش کر کے تمام مسئلہ کو حل کر کے روز روشن کی طرح عیاں کر دیا۔ کہ سورج اگرچہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور اسی وجہ سے شاہ خاور کو شرق سے ایک قدرتی نسبت ہے مگر چونکہ اس کا پروگرام اس قدر وسیع ہے کہ اس کا مقامی قید یا خصوصیت وطنی سے مستثنیٰ ہونا ایک لازمی امر ہے۔ وطنیت کے زہریلے کو دماغ سے نکال دینا چاہیئے ؎

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے | نور محمد علوی بی اے

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے | ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے | اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود | ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود | یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟ اقبال

اقبال اور مسلم

آج مدت کے بعد پریشان طبیعت جو بے وفائی زمانہ اور تیرِ حوادث سے مدہوشی کی نیند سو چکی تھی بیدار ہوئی دل وارفتہ ذرا پہلو میں قرار کرنے لگا۔ پراگندہ خیالات میں کچھ ربط سا ہوا اور مایوسی و بے خودی سے آنکھوں نے کروٹ لی بچارے مسلمان کی صحیح حالت کا نقشہ نظر آنے لگا تقاضائے اخلاق و انسانیت سے خونِ جگر کے آنسو دردِ قوم کی ترجمانی کرنے لگے مگر ساحلِ مراد سے ہمکنار ہونے والے لوگوں کے نتیجہ عمل نے اس کو بزدلی اور ناامیدی سے تعبیر کیا ؎

خدائی لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے　　یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

مسلم کی صحیح تاریخ اور تعریف پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ یہی اس کی شان ہے۔ اور اسی لئے خدا کے فرشتے کہتے ہیں۔ خدا فرشتوں سے فرماتا ہے ؎

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

وائے قسمت کہ یہی آسمانی پیغام ایک ہندی مسلمان اعلان کرتا ہے۔ شاید مسلمان کا ظرف اس قابل نہیں کہ اس انعام کو قبول کر سکے ورنہ اقبال بے مثال تو کہتا ہے اور بار بار کہتا ہے

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی　　ہے اس کا نشیمن نہ بدخشاں نہ بخارا

اقبال ایک قدرتی نباض ہے جو قوم کے مرضی کی امراض میں تشخیص کامل سے آتا دل لگی کی بات نہیں۔ جب بھی ہم گردن جھکا کر سوچتے ہیں تو یہ مسئلہ اظہر من الشمس ہو کر آنکھوں کے سامنے آتا ہے کہ امریکہ کے وہ انسان جن پر حیوانیت صادق اترتی تھی آج ممیز اقوامِ عالم کی صفِ اولیں میں جگہ لیتے ہیں۔ یورپ جن پر پسماندگی کی شبہائے تار چھا گئی تھیں وہاں آج ارتقا کے آفتاب فروزاں ہیں تو کیا یہ امکان سے بعید ہے کہ مسلمان جن کی شمع راہنما وہ خورشید ہے جو کہ ساری دنیا کے لئے منبع انوار ہے۔ ابھر کر آسمانِ عروج پر ستارے بن کے چمکیں۔ ہاں ہاں ممکن ہے اغلب ہے بلکہ یقین ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں　　نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

خیر یہ کہانیاں دراز۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ علامہ اقبال کی قابلِ تقلید صدا کی صحیح تفسیر کیا ہے

جس کا مجھے دعویٰ ہے کہ اس کے سمجھنے اور عمل کرنے پر ہم ایسی زندگی کے مالک بن سکتے ہیں۔ جو تیرہ سو سال پہلے ہمارے بزرگوں کے قبضہ میں تھی اور جس کے اختیار سے خاک کیمیا کا رنگ بدلتی ہے یعنی حبش سے بلال، روم سے صہیب اور عرب کے ویرانوں سے خالد شیر پیدا ہوئے۔ وہی دن وہی راتیں وہی صبح وہی شام وہی حق حق و ہو ہو کی صدائیں وہی حمد و تسبیح کی گردانیں۔ باایں ہمہ اسلامی دنیا نہ کوئی بلال اور نہ کوئی خالد پیدا کر سکی اور کس طرح پیدا ہوں خدا مغفرت کرے اقبال کو ؎

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور — تیری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں

پھر مجبور ہو کر یوں فرماتے ہیں ؎

متاع عقل و دیں با دیگراں بخش — غم عشق از بدست افتد نگہدار

چراغ تلے اندھیرا۔ بیچارہ مسلم اپنی حقیقت کو بھول گیا۔ اور اقوام غیر کی تہذیب و تمدن مستعار لینے لگا۔ مغربی گھٹاؤں سے بارش مانگی مگر کھیتی ویسی کی ویسی خشک رہی۔ یورپ کے میخانوں کی تلاش میں پھرا۔ لیکن جس ذوق و مستی کی تڑپ تھی وہ کہاں میسر ہوتی تھی اقبال کہتا ہے کہ ہر روگ کی تشخیص ہر حکیم سے نہیں ہوا کرتی اور مسلم کے معالج دنیا میں نہیں مل سکتے یہ اپنا معالج آپ ہے ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

مسلم کی زندگی ایک فاتح عالم کی زندگی ہے۔ مسلم کا لائحہ عمل عمر فاروق کا نقش قدم یعنی خداوند ذوالجلال کا بتایا ہوا راستہ ہے۔ اور جس کے حصول کے لئے اقبال سربسجود ہو کر درگاہ ایزدی میں یوں اپیل کرتا ہے۔

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر — حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نان جویں بخشی ہے تو نے — اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

اقبال کے زاویہ نگاہ سے مسلم کی شان زمانہ کی تقلید کرنی نہیں ہے زمانہ کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا ہے۔

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز — زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

مسلمان اسباب و حالات کا محتاج نہیں اگر زمین موافق نہیں تو آسمان سے مدد ملتی ہے بشرطیکہ پہلو میں دل ہو اور

؎ رگوں میں خون ہو اور خون کے اندر حرارت ہو۔ کیونکہ

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
اقوامِ عالم کے پہلو بہ پہلو چلنا مسلم کی ہتک۔ فرشتوں سے ہم پرواز ہونا مسلم کی کمزوری۔
ے درِ دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ
افسوس کہ اپنی علمی بے بضاعتی کے باعث ایک ایسی شیریں حکایت میں اختصار برتنا پڑا اور ہزار میں ایک بھی نہ کہہ سکا ے حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم
میرا کیا منہ کہ اقبال کے سے حقیقت کے ترجمان۔ انسانیت کے معلم اور خودی اور خود آگاہی کے رموز سکھانیوالی عالمگیر ہستی کے ان قطراتِ اشک کا شمار کروں جو اس نے قوم میں نئی روح پھونکنے اور غلاموں کو درسِ خودداری کے لئے گرائے۔ ہاں اتنا کہے دیتا ہوں کہ مردہ روحوں کے لئے مسیحا ہے اور پژمردہ دلوں کے لئے آبحیات کی مشکیں لائے۔ اللہ کرے کہ ہم اس کے مخلص مقلد بنیں اور اس احسن و افضل جادہ پر چل سکیں جس سے اپنے دامن کو گلہائے مراد سے مزین کرسکیں۔
ے ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

اللہ داد خاں قیصر
بی۔ اے۔ فائنل

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
(۲۴) حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا
دیں ہاتھ سے دیکر اگر آزاد ہو ملت ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
(۲۵) مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟ کیوں تری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
(۲۶) ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
(۲۷) ہیں ساز پہ موقوف نوا ہائے جگر سوز ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مضراب
(۲۸) گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو تھرتھراتا ہے جہانِ چار سو و رنگ و بو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو
(۲۹) نشان یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
شکوۂ عید کا منکر نہیں ہیں لیکن قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں
(۳۰) خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

اقبال مرحوم!

اقبال جیسی ہستی کی شان میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ تاہم محبت و اخلاص کا ایک پھول بھی اگر نچھاور کر دوں تو امید ہے کہ وہ بناوٹی پھولوں کے ہزار گلدستوں سے کہیں بڑھ کر ہوگا!

اختر ربّانی

کیا سمجھ کر موت نے آغوش میں کھینچا تجھے ؟
کیا سمجھ کر اس فلک کے دَور نے گھیرا تجھے ؟

کیا نہیں معلوم تھا تیری ضرورت تھی ابھی ؟
امتِ مرحوم کی تکمیل باقی تھی ابھی ؟

تو ہی تھا باقی ہدی خواں کاروانِ دین کا
ملّتِ بیضا کا حامی اور محافظ دین کا

تیرے ہی دم سے تھی قائم محفلِ اہلِ صفا
تو ہی اک یاور تھا باقی ملّتِ اسلام کا

گردشِ گردونِ گرداں نے عجب چرکا دیا
ساقیٔ رنگیں ادا محفل سے اپنی چل بسا

کیف باقی ہے مگر اس کی خودی کے جام کا
اور کانوں میں صدا گونجیگی وہ بانگِ درا

اختر ربانی
سیکنڈ ایئر

کلامِ اقبال

اقبال ایک فلسفی۔ مذہبی اور مصور شاعر تھا۔ اس کا کلام مذہب اسلام کی گود میں پلا اور پروان چڑھا۔ وہ ہر چیز کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتا اور پھر سختی سے اس پر کاربند ہوتا۔ اس کی روح آزاد تھی اور وہ ہر وقت آزادی کے خواب دیکھتا۔

وہ جس چیز کی بھی تصویر کھینچتا۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لفظوں میں جان ہے اور ان الفاظ کی جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مصوّر کا یہی سب سے بڑا کمال ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی چیز کی تصویر کھینچے تو اس کے رگ و ریشے تک کو ظاہر کرے اور یہی بات ہم اقبال میں پاتے ہیں کہ وہ جس چیز کی بھی تصویر کھینچتا ہے تو بال کی جڑ تک نمایاں کرکے چھوڑتا ہے اور جو اس نے وادی یا پہاڑ کی تصویر کھینچی ہے تو پہاڑ پر اگی ہوئی گھاس کی پتیوں تک نمایاں ہیں۔ اس کی تصویریں صاف اور جاذب نظر ہیں کہ دیکھنے والوں کو اصل اور نقل میں دھوکہ ہوتا ہے۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ ایک ہی قسم کی کئی تصویروں کو دیکھ کر طبیعت اکتا جاتی ہے۔ تو اس کے لئے بھی اقبال نے انتظام کر رکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قابل مصوّر کو چاہئے کہ پرانی طرز کو چھوڑ کر نئی طرز اختیار کرے اور ساتھ ہی اس میں جدّت پیدا کرے ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش | براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کارِ نادر آید | گناہِ ہم اگر باشد ثواب است

"پیامِ مشرق"

اقبال نے اپنے مجموعہ کلام اردو "بانگِ درا" کی ایک نظم "ایک آرزو" میں اپنے لئے دعا مانگی ہے کہ اے خداوند جہاں مجھے وہ جگہ عطا فرما کہ جہاں سے شور و غل کا گذر نہ ہو۔ ندیاں ہوں۔ پہاڑ ہوں۔ سبزہ زار ہوں بلبلِ نغمہ خواں ہو اور ساتھ ہی ؎

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں | ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی | جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو

ان اشعار میں قابلِ غور پودوں کی عکسی تصویر۔ گل کی ٹہنی کا جھکنا اور پھر اس کو ایک حسین سے تشبیہ دینا کتنا دلکش ہے۔

اقبال بلا کا ذہین اور دور اندیش شاعر تھا۔ وہ ایک ننھی سی جان جگنو کو جو رات کے وقت باغ میں اِدھر اُدھر اڑتا ہے۔ قابل غور سمجھتا اور اس کی اس قدر نفیس تصویر کھینچتا ہے کہ داد نہ دینا گناہِ عظیم ہے ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

تکمہ کوئی گرا ہے ماہتاب کی قبا کا ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

ایک جگنو کو پھولوں کی انجمن کی شمع۔ ایک ستارہ۔ ماہتاب کی کرن۔ ماہتاب کی قبا کا تکمہ وغیرہ تشبیہات دینا۔ بچوں کا کھیل نہیں۔

اور دیکھئے جب کاروانِ حجاز کا نقشہ کھینچا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ہم بھی شاعر کی دوربین نگاہوں کے ساتھ محوِ تماشا ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

"اسرارِ خودی" میں ایک پھول پر پڑی ہوئی شبنم کو کس خوبی سے" اشک چشم بلبل" سے تشبیہ دی جاتی ہے ؎

قطرۂ شبنم سرِ شاخ گلے تافت مثل اشک چشم بلبلے

"بانگِ درا" میں "ابر" کے عنوان کی نظم میں ارشاد ہوتا ہے ؎

گرج کا شور نہیں ہے خموش یہ گھٹا عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

"میکدۂ بے خروش" کو کس خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔

ایک اور جگہ تصویر کھینچی ہے ؎

وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار رو دے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار

اسی سلسلہ میں ماہِ نو کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

خورشید کا ٹوٹنا اور اس کے ایک ٹکڑے کو آسمان کے دریائے نیل میں ماہِ نو سے تشبیہ دینا۔ سبحان اللہ۔

آخیر میں یہ کہہ دینا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کے کلام میں موسیقی کو بڑا دخل ہے۔ اس کی کئی نظمیں ایسی ہیں کہ جن کو پڑھ کر ناچنے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

اقبال کے کلام میں۔ سوز و گداز۔ ولولے۔ امنگیں۔ تمنائیں۔ تصوف سبھی کچھ تھا جو ایک قابل اور آزاد سر شاعر کی شخصیت میں پایا جاتا ہے۔

اختر ربانی
سیکنڈ ایئر

آں عزمِ بلند آور آں سوزِ جگر آور　　شمشیرِ پدر خواہی بازوئے پدر آور
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ　　کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ
مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے　　وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے　　تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو　　تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے　　جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے
زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے　　غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے
بپا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں　　یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنی مرہم کو
اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو　　مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟
دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے　　پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا
پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری　　ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا کیونکر ہوا
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ　　کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اقبالؒ

حضرتِ اقبال آں بالغ نظر — از ضرورت ہائے ملت باخبر
حضرتِ اقبال روحِ آرزوست — زندگی اش محکم از لاتقنطوست

حضرتِ اقبال آں فرہاد زاد — از درِ پرویز عالم بامراد
فکرِ آں صاحب نظر گردوں میر — پرورشِ دانائے یونانی فقیر
واقفِ سرِّ جہاں ہست و بود — پیرِ رومی گفت او را زندہ رود
صاحبِ بانگِ درا، ضربِ کلیم — غنچۂ امید دنیا را شمیم
او پیامِ مشرق با افرنگ داد — ہست بالِ جبریل آں پاک زاد
در کلامش دیدہ ام آبِ حیات — نوش کن ایں را اگر خواہی نجات
در جہانِ شاعری پیغمبر است — در ضمیرِ او حقیقت مضمر است
واقفِ پیغامہائے مصطفےٰ است — کشتیٔ اسلامیاں را ناخدا است
کرد آں روشن ضمیر آں بختیار — خاوراں را بار دیگر ہوشیار
آشکارا کرد اسرارِ خودی — خویشتن بینی را گوید زندگی
سرِّ مازاغ البصر را فاش کرد — روح آواز درو قوم آمد بدو
عشق را از فعلِ لا آگاہ کرد — آشنائے رمزِ اِلاّ اللہ کرد
اے فدائے مصطفےٰ اے شاہ من — ایں زجاجِ کفر را برسنگ زن
شادماں کن حضرتِ اقبال را — رہبرِ اسلامیانِ حال را

محمد نواز شہید
بی۔ اے

"نئی تہذیب" ——— علامہ اقبال کی نظروں میں

انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے کہ جس پر علامہ مرحوم نے سیر حاصل بحث نہ کی ہو۔ وطنیت، قومیت، مذہب، تعلیم اور تہذیب غرض ہر ایک مضمون کو بہترین اور خوبصورت پیرائے میں ادا کیا ہے جس قابلیت اور لطف سے مضامین کے موتیوں کو ٹانکا ہے بس کچھ انہی کا حصہ ہے۔ اپنے موضوع کے ہر پہلو پر اس قدر روشنی ڈالتے ہیں کہ کوئی شے قابل ذکر باقی نہیں رہ جاتی۔ اقلیم سخن کے بادشاہ علی الاطلاق ہیں۔ جو چیز ان کے قلم سے نکل جاتی ہے۔ اس پر دم مارنے کی کسی کو ہمت نہیں پڑتی۔ سوسائٹی کی کمزوریوں کو ایسے حسین اور جمیل لہجے میں ادا کرتے ہیں کہ ان کمزوریوں کے حامل نادم ہو کر دامن میں منہ چھپا لیتے ہیں۔ اقبال کا مذہب شیخ اور برہمن، دیر اور حرم سے بالکل جدا ہے۔ وہ بلا امتیاز مذہب و ملت خدا کی ہر ایک مخلوق سے محبت کرتے ہیں۔ کسی کا دل دکھانا ان کے نزدیک عظیم ترین گناہ ہے۔ اگر قوم کی کسی لغزش پر انہیں قلم اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے تو قوم کو ایسے طریقے سے متنبہ کرتے ہیں کہ افراد قوم حد سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ تہذیب و اخلاق کے مقابلہ میں علامہ مرحوم کا رویہ بالکل علیحدہ ہے۔ وہ پرانے زمانے کے سیدھے سادے طریقوں اور بھولی بھالی رسموں پر دل و جان سے فدا ہیں۔ وہ ایام گزشتہ کے بیحد شیدائی ہیں فرماتے ہیں ؎

ہاں دکھا دے اے تصوّر پھر وہ صبح و شام تو　　دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

زمانہ نو کی نیرنگ بازیاں اور عشوہ طرازیاں آپ کو ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ وہ اس زمانے کے چوچلے اور نزاکتیں قطعاً پسند نہیں کرتے۔ آج کل کی نئی روشنی میں ان کو ایک زبردست تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ اس تہذیب میں آپ کو ہزاروں اخلاق اور ادب سوز چیزیں نظر آتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں　　نئی تہذیب کے گندے ہیں انڈے
الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت　　بنائے خوب آزادی نے پھندے

یورپ کے طور و اطوار، طرزِ بود و باش سرزمینِ مشرق کو قطعاً موافق نہیں۔ علامہ اقبال نے یورپ کی بذاتِ خود سیر کی ہے ان کی راہ و رسم اور عریانی کا اچھی طرح سے مطالعہ کیا ہے آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب باتیں تہذیب سوز ہیں۔ مغربی طریقۂ تعلیم ان کی نظروں میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ ان کا عندیہ تعلیم کے متعلق یہ ہے۔ کہ تعلیم ایسی حاصل کرنی چاہیئے جو اپنے بزرگوں کے اقوال پر کاربند ہونے کا سبق دے۔ جو اسلاف کے جلیل القدر کاموں پر کاربند ہونے کی ترغیب دے۔ جو آزادی اور ترقی کا سچا رستہ دکھائے۔ وہ تعلیم جو فقط کتابوں ہی تک محدود ہے بالکل بے سُود ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

من آں علم و ہنر را باپرِ کاہے نمے گیرم کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

مستشرقین کالج کی نقل کرتے ہیں۔ مگر مغرب والوں کے جذبۂ آزادی اور ایثار کی نقل سے پرہیز کرتے ہیں۔ طلبا کی ضد ہے کہ اس کھلی ہوا میں۔ اس روشنی کی خیرہ کن چمک میں کسی چیز کا پوشیدہ رہنا پرلے درجے کی دقیانوسی ہے۔ پردہ کے خلاف علمِ جہاد بلند کرتے ہیں۔ خدا جانے اس بات میں ان کی کونسی مصلحت پوشیدہ ہے۔ مرد اور عورت کے امتیاز کو مٹا دینا غالباً ان کا نصب العین ہے۔ علامہ مرحوم ارشاد کرتے ہیں ؎

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں مفت میں کالج کے لڑکے اُن سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے صاف صاف پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

مغربی تعلیم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس کی پہلی بسم اللہ ہی غلط ہے۔ جوں جوں بدن میں اثر پذیر ہوتی ہے۔ اعضا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ کاہلی ہمارا پیچھا کرتی ہے ہم ادب و شعور سے مرحوم ہو جاتے ہیں۔ آرام طلبی ہمارا شیوہ ہو جاتا ہے۔ علم و ہنر ہم میں مفقود اور کسب و کمال ہم میں نابود۔ ہم ترقی کے زینے سے لڑھک کر قعرِ ذلت میں جا گرتے ہیں۔ دوسروں کے دستِ نگر ہو جاتے ہیں۔ علامہ مرحوم اس پر روشنی ڈالتے ہیں ؎

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ
بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ

نئی روشنی اور نئی تہذیب کے چکر میں آ کر ہم اپنی خداداد قابلیتوں سے کام نہیں لیتے ہم اپنی خودداریوں کو سینے میں دفن کر دیتے ہیں۔ ہزاروں کمال ہمارے جسموں میں بیتاب ہیں

مگر ہم محوِ خواب ہیں۔ بادۂ غفلت کے وہ جام چڑھائے ہوئے ہیں کہ جن نے ہوش و حواس گنوا دیے ہیں انجام خدا جانے۔

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئینگے غسال کابل سے، کفن جاپان سے (اقبال)

نئی روشنی کے طوفان نے پیر و جوان، زاہد و رند، شیخ اور صوفی سب کو یکساں لپیٹ لیا ہے۔ اس کی مہربانیوں سے ذاتی اغراض نے اس قدر پاؤں پسارے ہیں۔ کہ پرہیزگار سے پرہیزگار بھی اس رَو میں بہ نکلا ہے۔ اس روشنی کی امنگوں نے دلوں سے محبتِ دین اور جذبۂ ملت نقش کالعدم کرکے رکھ دیا ہے دین کے عوض دنیا کو خریدنا بہت میٹھا سمجھ رکھا ہے۔ خدا اور خدا کے پیاروں کی باتیں ان کے لئے وجہ تسلی نہیں۔ بزرگوں کے قول کے قائل نہیں اور شرع پر مائل نہیں علامہ فرماتے ہیں ؎

ہاتھوں سے اپنے دامنِ دنیا نکل گیا
رخصت ہوا دلوں سے خیالِ معاد بھی
قانونِ وقف کیلئے لڑتے تھے شیخ بھی
پوچھو تو وقف کیلئے ہے جائداد بھی

ڈاکٹر اقبال کو اپنے وطن کا ذرہ ذرہ پیارا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ وطن کی معمولی چیز نئی روشنی کے خوشنما سے خوشنما چیز سے کہیں بہتر ہے۔ زمانہ گذشتہ کے بھولے بھالے نظارے انہیں بیتاب رکھتے ہیں۔ وہ مٹی کے دیئے کو الیکٹرک کی خیرہ کن روشنی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ گھوڑے اور اونٹ کی سواری کو ہوائی جہاز اور شیورلیٹ سے کہیں زیادہ اچھا سمجھتے ہیں۔ وہ نئے زمانے کی عریانوں کو تحقیر آمیز نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ نئی دنیا کی نئی جدتوں سے متنفر ہیں۔ ان کا قول ہے کہ جو قوم دوسروں کے طریقے اور شیوے اختیار کرتی ہے۔ جو غیروں کا دم بھرتی ہے۔ جو اپنی کٹیا پر قانع نہیں اور غیروں کے محلوں کو دیکھ کر اپنی جھونپڑی کو آگ میں جھونکتی ہے اس سے آزادی نفرت کرتی ہے۔ اس سے آدمیت دُور بھاگتی ہے۔ وہ قوم اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ترقی کرتی ہے تو وہ قوم جو اپنے استقلال میں ثابت قدم اور جس کے افراد اپنے وطن کی چیزوں سے مایوس نہیں۔ علامہ مرحوم ارشاد فرماتے ہیں ؎

ہم مشرق کے مکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے
اس دور میں سب مٹ جائینگے ہاں باقی وہ رہ جائیگا
جو قائم اپنی رہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

محمد عبدالحمید تاتاری فورتھ ایر کلاس

اقبال

اے کہ تیرا وجود ہے باعثِ فخرِ ادبیات　　　اے کہ ترا دماغ ہے مایۂ صد تخیلات
اے کہ تیرے سخن میں ہے رنگِ کلام ساحری　　　اے کہ ترے نفس سے ہے جاگی خدا کی کائنات
اے کہ تری نگاہ میں مصر و حجاز و جینوا　　　شام ہے بلخ ہے قرطبہ، روم و فرنگ و سومنات
اے کہ تری خودی ہی ہے رازِ حیاتِ جاوداں　　　اے کہ تری شہنشہی رشکِ ملوکِ شش جہات
اے کہ ترا فلسفہ درس و پیام و غور و فکر　　　اے کہ یہ درد و سوز و غم مظہرِ رازِ قومیات
اے کہ "رموزِ بے خودی" تیرے قلم سے آشکار　　　اے کہ طریقِ شیخ و رند تیرے ہیں سرِّ نظریات
اے کہ ترا مقام ہے چاند ستاروں سے پرے　　　اے کہ ترا قیام ہے جائے دل و تصورات
اے کہ غلامِ ہند کی تو نے نگاہ پھیر دی　　　بندۂ حر کے سامنے رکھ دئے سب مشاہدات

اے کہ تیرے لئے اگر کارِ جہاں دراز تھا
ہم سے کیوں جلد موڑ لی تو نے نگاہ التفات؟

عطا محمد دلشاد کلانچوی
بی۔ اے (اولڈ بوائے)

"شاہین"
اقبال کی نظر میں

بقول حضرت سلیمان ندوی "اقبال کی شاعری شاعروں کی حدود سے نکل کر خالص حکمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکی ہے - اور اِنّ مِنَ الشعر الحکمۃ کی خلعتِ نبوت سے سرفراز ہو چکی ہے اب ان کی شاعری میں جذبات کا سراب نہیں . بلکہ عقل و حکمت کا سرچشمہ ہے اب وہ لطف و لذت نہیں بلکہ بصیرت اور موعظت ہے . وہ مسلمانوں کو اب ان کے بزرگوں کا تاریخی پیغام سنانے کے لئے نہیں بلکہ ان کو قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ سمجھانے کے لئے ہے - وہ اب میدان جنگ کا رجز خواں یا مسافران راہ کے لئے بانگ درا نہیں بلکہ غور و فکر کے غارِ حرا سے ناقوس اکبر کی آواز اور جبریل امین کا پیام ہے" غرضیکہ وہ بین الاقوامی شہرت و عظمت والا - بیک وقت زبردست شاعر - متبحر عالم - بلند فلسفی - اعلیٰ سیاستدان اور خود غرض وطنیت سے پاک ایک پکا مذہبی انسان ہے - جہاں اسلامی تاریخ و فلسفہ اور فقہ اور تصوف کا ایک جیّد عالم ہے - وہاں قدیم و جدید یورپین علوم کا ماہر اور نبض شناس بھی ہے اس کے نزدیک حرکت زندگی کا مقصد اولیٰ ہے وہ ان بے عمل پیروں کو جو شب و روز اپنے حجروں میں بند تسبیح کے دانے گنا کرتے ہیں یا اپنے مریدوں سے پیسوں اور سجدوں کا خراج حاصل کرتے ہیں سوداگرانِ دین فروش سے کچھ کم نہیں سمجھتا ہے - اس کا مذہب ع "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی" ہے -

شاہین حضرت اقبال کی دور رس نظروں میں محض شکاری پرندہ نہیں بلکہ اپنی سادگی خودداری ہمت - شجاعت - استقلال اور آزادی کی روح کا مالک - حیوانی رہنما ہے - حضرت اقبال شاہین کی کتاب حیات سے اپنی مردہ - مست - وہمی - بزدل - مادہ پرست - نااندیش - ملول و حزین - بے عمل اور پستی سے نفرت - موجودہ زمانہ کی روش - امید و مسرت کے جذبات - مصائب اور ناکامیوں کا مقابلہ کرنا - عملی دنیا کا پروگرام اور سادگی و عظمت کا درس سکھانا چاہتے ہیں -

ہستی انسان کو شاہین کی تشبیہ سے یوں بیان فرماتے ہیں :-

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو — فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور — کہ شاہینِ سر لولاک ہے تو

شاہین کی عظمت و بزرگی اور اس کی سر بلندی کے بھی وجوہ ہیں فرماتے ہیں ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یعنی شاہین کی قسمت شاہین کے ساتھ ہے ؎

پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار شکارِ تازہ کی لذّت سے بے نصیب رہا

حرکت کو حضرت علامہ زندگی کی روح سمجھتے ہیں۔ اور حرکت کی برکتیں شاہین کی ایک کہانی میں یوں گنواتے ہیں :۔ ؎

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سالخورد اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

حضرت اقبال اپنی قوم کے فرد کو عملی زندگی کا سبق دیتے ہوئے اسے جدوجہد اور عزمِ بلند کی تحریص کرتے ہیں ؎

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

اور یوں ہمت بندھاتے ہیں ؎

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا پُر دم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ افتاد

بلکہ شاہین کو کسی اور فضا میں لے جانا چاہتے ہیں۔ اس کا عزم بلند اور ہمت پرواز کے لئے ابھی اور آسمان ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

قومی پستی اور بے عملی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے ایک معیارِ حیات قائم کیا ہے اور نام کے مسلمانوں پر ان کی تنقید بجا ہے۔ اور اپنی اصل ڈھونڈنے کی تلقین یوں فرماتے ہیں :۔ ؎

تیرا اندیشہ افلاکی نہیں ہے تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہیں ہے تری تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

بلکہ غیرت دلاتے ہیں اور رشک پیدا کرنے کے لئے فرماتے ہیں ؎

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

زندگی کی تگ و دو اور ارتقائی منازل طے کرنے میں ہزاروں مشکلات کے علاوہ

حاسدوں کا حسد۔ دشمنوں کی چہ میگوئیاں اور اغیاروں کی غیبتیں بھی مانع عمل ہو جاتی ہیں۔ لیکن عزم بلند۔ اندیشہ افلاکی بے خطر دل، اور آنکھوں میں بیباکی والا شاہین ان باتوں سے بے پرواہ ہو کر کمزوری عمل کا شائبہ تک ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ شاہین کی مزید دلجوئی یوں فرماتے ہیں ؎

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر — شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیک شہباز! امرغان صحرا کے اچھوت — ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر
ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام — روح ہے جس کی دم پرواز سرتا پا نظر

تہذیب فرنگ جس کی بنیاد بے روح عقلیت پر رکھی گئی ہے۔ اور جس کی ہلاکت و تباہی کے دن قریب آ گئے ہیں۔ آج ایشیائی ممالک کا فخر تقلید حاصل کئے ہوئے ہے یہ کیوں ؟ اس لئے کہ ہمارے افراد کھرے کھوٹے کی پہچان سے عاری ہیں۔ وہ فرنگی تہذیب کے دلدادہ ہو گئے ہیں۔ اور اپنی اولاد کے لئے بھی دنیوی اور روحانی ترقی کی راہیں مسدود کر رہے ہیں۔ کیونکہ ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہے کرگسوں میں — اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شہبازی

کورانہ تقلید اور بُری سوسائیٹیوں کا اثر لازمی اور فطری ہے کیونکہ ؎

شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار — کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغان سحر خیز
اور ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی — خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ

علاوہ ازیں ان روشن دماغ مسلمان زادوں نے مکتب میں جذبۂ دین کھویا۔ اور کم نظر شیخ نے ان کے مقام سے انہیں آشنا نہ کیا۔ بلکہ انہیں خودی سے بیگانہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مرغان سرا کی طرح خاک میں دانہ تلاش کرنے لگے۔ اور فضائے نیلگوں کی وسعتوں سے ناآشنا رہے۔ یہ سب کچھ خداوندان مکتب کی کم نظری و کم سوادی کا رونا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے — سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

حضرت اقبال کا کام بھی یہی تھا۔ کہ وہ اپنی قوم کے نونہالوں کو اس قعر مذلت سے نکالنے اور غلامی کی آہنی کڑیوں سے آزاد کرانے میں رہنمائی فرمائیں۔ چنانچہ انہوں نے صرف اپنے جاوید کو نہیں بلکہ اپنی قوم کے نونہالوں کو ان کے مقام سے آشنا کیا ہے۔ اور کورانہ تقلید کے ماحول کو تبدیل کرنے کے لئے فرماتے ہیں ؎

اے جان پدر نہیں ہے ممکن — شاہیں سے تدرو کی غلامی

پھر اپنے معمول کی آہ سحرگاہی سے ان نوجوانوں کی ترقی کی دعا کرتے ہیں ؎

جوانوں کو مری آہ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

اور دعا کی مقبولیت "فرمانِ خدا فرشتوں کے نام" سے یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

گرمادو غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سادگی و پرکاری حضرتِ اقبال کا مطمعِ نظر ہے۔ وہ سادگی کو زندگی کا ایک جزوِ عظیم اور ارتقا، تمدن کا زینہ سمجھتے ہیں۔ وہ دنیوی مال و جاہ کو ٹھکراتے ہیں۔ وہ خواجگی اور بندگی کی تفریق کے مخالف ہیں۔ مگر سادگی خودداری اور آزادی چاہتے ہیں۔ آپ نے شاہین کی سادگی اور خودداری کی مثال یوں تحریر فرمائی ہے۔

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں　　کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کار آشیاں بندی

بلکہ اپنی بے باک۔ آزاد۔ عزم بلند نژاد کو خواجگی سے پرے رہ کر سر بلندی اور خودداری کی تعلیم دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور مزید خودداری اور بے نیازی کا سبق چیونٹی اور عقاب کی گفتگو اور ان کے حال و قال کے بیان میں یوں دیتے ہیں۔ چیونٹی

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند　　ترا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب اپنی عقابیت یوں جتلاتا ہے ؎

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں　　میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں!!

اب بھی اگر مغرب زدہ۔ خام خیال اور غلام قوم آزادی کا سانس لینا چاہتی ہے۔ تو کوئی مشکل نہیں۔ کیونکہ ؎

چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس　　اور پھر جی سکتے ہیں بے روشنیِ دانش و فرہنگ

شاہین کی مکمل زندگی کا نقشہ بھی درس و پیام کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ حضرت اقبال خودی جیسی کیفیت کا لفظی خاکہ اس کے منہ سے یوں کھینچ اتے ہیں ؎

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارہ　　جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

اور خلوت اور رہبانیت کی چاشنی یوں دیتے ہیں:۔

خیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو　　ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

نہ بادِ بہاری نہ گلشن نہ بلبل　　نہ بیماریِ نغمۂ عاشقانہ

کیونکہ ؎ خیابانیوں سے ہر چند پرہیز لازم ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
زہد و تقوی - فقر و توکل - خودداری اور مسلکِ حیات کو شاہیں کی زندگی میں یوں
منظوم فرماتے ہیں ؎

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں ہوں کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا - پلٹنا - پلٹ کر جھپٹنا لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا میرا نیلگوں آسماں بیکرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

الغرض شاہیں اقبال کی نظروں میں ایک جوانی پرندہ سے بڑھ کر بلند ہمتی اور سرفرازی کا اکیلا مالک ہے - وہ صرف کنجشک - تدرو - چکور - حمام - کبوتر - کرگس اور بلبل سے بڑھ کر اعلیٰ حیات اور بلند اقبال پرندہ نہیں - بلکہ پست ہمت - کوتاہ مقلد اور بے حرکت ہستی انسان کو پستی کی گہرائیوں سے اٹھ کر بلندی کی آخری منزل تک پہنچنے کی مثال پیش کرتا ہے - حضرت اقبال بھی اپنی مردہ اور خفتہ قوم کو شاہیں کا سبق پڑھا رہے ہیں - علامہ موصوف مشتِ خاک میں نور کی چنگاریوں کو ڈھونڈتے ہیں - زندگی کا سوز و ساز اور جذبۂ ارتقاء کا نشو و نما ایک مسلسل جد و جہد اور دوامی تگ و دو میں دیکھتے ہیں - وہ اپنے میٹھے میٹھے گیتوں سے سوتوں کو جگاتے جاگتوں کو درسِ حیات پڑھاتے - عاملوں کو عمل کی تلقین کرتے اور مدبروں کو باریک نکات بتاتے ہیں ؎

عطا محمد دلشاد کلانچوی
(بی - اے راولپنڈی)

عزیز تر ہے متاعِ حیات اس سے
[illegible] عطا نے دیا ہے ذوقِ سلیم
زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

اقبال کا فلسفۂ حیات

اقبال کون ہے ۔ یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ دُنیا کا ہر ایک حصّہ اُس کے نام سے آشنا ہے ۔ وہ ایک بین الاقوامی شہرت کا مالک اور عزّت و اقبال کا تاج ہے ۔ وہ کیوں مشہور ہے اس لئے کہ وہ دورِ جدید کے شعرا کی اوّل صف کا ایک ممتاز رہنما ہے اور بہترین شاعر ہے ۔ اس کی شاعری کے متعلق لوگ کیا کیا نہ کہیں گے مگر سچ پوچھو تو اقبال کے سرود مستانہ کی تار سب سے زیادہ دلکش اور مؤثر ہے ۔ اس کی شاعری میں تغزل بھی ہے اور ترنم بھی ۔ اس میں شوکتِ الفاظ بھی ہے اور چستی بندشیں بھی ۔ خیالات کی بلندی اور گہرائی اس کے دامن سے وابستہ ہے ۔ اس میں داغ کی زبان ۔ غالب کا فلسفہ اور حالی اور شبلی کی توصیف ہے ۔ اور اس کے علاوہ اس میں وہ چیز ہے جس کا عنصر دوسروں کے ہاں کم ہے ۔ اس کی شاعری کے اندر پیامِ عمل ہے ۔ جو فلسفۂ حرکت و حیات ہے ۔ اس کا وجود ملّت کے لئے سرتاپا عمل ہے اور جو صحیح شاعری کا مقصد ہے ۔ ورنہ دوسری شاعری جو محض قوالی کی محفلوں کی زینت اور کتب خانوں کی آرائش ہو کر رہ جاتی ہے بے فائدہ اور تضیع اوقات کا موجب ہے ۔

اقبال کی شاعری یاس اور نا امیدی سے پاک ہے ۔ وہ نہ تو خود نا امید ہوتا ہے ۔ نہ دوسروں کو نا امید ہونے دیتا ہے ۔ وہ حزن اور یاس والے انسانوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے ۔ وہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی دامن استقلال کو آہنی پنجے کی گرفت سے پکڑتا ہے ؂

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے ۔۔۔ ہے بھروسہ اپنی ملّت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار ۔۔۔ فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

وہ اُمید ۔ ۔ ۔ ۔ اُمید ۔ ۔ ۔ ۔ ہر حالت میں اُمید کا روشن چہرہ دیکھتا ہے ۔ اور کہتا ہے ع پیوستہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

وہ اسی اُمید کے بل بوتے پر کہتا ہے کہ اپنے دامن کو اور بھی وسعت دے ؂

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے کامل ہے شان تیری
دفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

اسی مضمون کو ایک اور جگہ یوں ادا کیا ہے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگیِ داماں بھی ہے

اب جب اُمنگیں اور آرزوئیں پیدا ہوگئیں ۔ یاس و ملال کا مچلا وہ غائب ہو گیا۔ تو وہ عمل کا پیغام دیتا ہے ۔ اور کہتا ہے ۔ کہ آرزو بغیر عمل کے ایک مہمل چیز ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جب اس طرح جوش عمل پیدا کر لیا۔ تو وہ ایک معیارِ حیات مقرر کرتا ہے جس میں کسی قسم کی خامی نہ رہے ۔ وہ اس بات کا قائل ہے۔ کہ جو مزا تگ و دو اور سعی کرنے میں ہے۔ وہ خود حصولِ مقصود میں بھی نہیں جیسا کہ ایک نظم میں لکھا ہے ۔ جہاں ایک بوڑھا عقاب اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے ؎

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

وہ سمجھتا ہے کہ غم ہی زندگی کے راز کو کھول سکتا ہے ؎

جو خزاں نادیدہ بلبل ہو وہ بلبل ہی نہیں

اور ؎

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے عشق جس کا بےخبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اقبال زندگی کو ایک ابدی اور غیر فانی چیز سمجھتا ہے ۔ اس کے ہاں موت زندگی کے توقف کا نام ہے ۔ اور زندگی کوئی غیر متغیر شے نہیں ہے ؎

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں ٹوٹنا جس کا مقدر ہو وہ یہ گوہر نہیں

زندگی ہر لمحہ اپنے لئے ایک نئی شان چاہتی ہے ۔ اور موت اس آرزو کے حاصل ہونے کا ذریعہ ۔ موت بظاہر ایک مہیب اور خوفناک شے ہے ۔ لیکن حقیقت میں یہ کچھ اور ہی ہے ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

گھمنڈا سنگھ طالب
بی ۔ اے (اولڈ لوئے)

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا ؟ قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا ؟
پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے ؟ بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے ؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو ؟ کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو ؟
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے ؟ منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے ؟

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر ؟

اقبالؔ

---

(۴۱) تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈھ ۔ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
سوداگری نہیں ہے یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے
(۴۲) تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا
(۴۳) خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
(۴۴) نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر
پہلے خوددار تو مانندِ سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر
(۴۵) ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
(۴۶) عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ شوق یک دانائے راز آید بروں
(۴۷) موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی
(۴۸) سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
(۴۹) غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقیں محکم ۔ عمل پیہم ۔ محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
(۵۰) عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
(۵۱) پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی !
(۵۲) خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

پیام اقبال

سہ نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں!

چمکتے ہوئے ستاروں سے فضائے آسمانی بھری پڑی ہے۔ لیکن دمدار ستارے ہمیشہ طلوع نہیں ہوتے۔ سطح زمین شیریں چشموں کی نہروں اور ندیوں سے پُر ہے۔ لیکن آب حیات کس کی قسمت میں ہے؟ خدا کی زمین خزانوں سے معمورہ ہے۔ ہاں ہند کی خاک پاک نے جو جوہر اگلا۔ دنیا کے جوہر اس پر قربان۔ لعل نچھاور۔ واہ ہند کا اقبال سہ

چو تو مصرعہ نخواندم ہمہ مو بمو لطائف چو تو صور نے ندیدم ہمہ سربسر معانی

شیکسپیر کے شیدائی یا ملٹن کے متوالے شاید یہ مدح کے گیت نہ سن سکیں۔ عقیدت والفت کی مجبوریوں میں ان کے لئے خلیفۂ وقت اور لیلیٰ کا سوال وجواب بس ہے کہ سہ

آں خلیفہ گفت کاں لیلیٰ توی کز تو مجنوں شد پریشانی وغوی
از دگر خوباں تو افزوں نیستی گفت خامش شو کہ مجنوں نیستی

اس میں کلام نہیں کہ ہندی ہو لیکن مسلمان۔ حق گزار نہیں ہو سکتا۔

ع۔ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

اگر ایرانی یا رومی ہوتا۔ تب بھی یہی داستان ہوتی۔ کیونکہ انصاف کا فیصلہ یہی ہے سہ

بلبل از گل بگزرد گر در چمن بیند مرا
بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

زلیخائے مسلسل کی حکائتیں۔ سوز و فراق کے نالوں اور بوس و کنار کی بہاروں سے قوموں کی ادبیات آراستہ ہے۔ لیکن قوم کے درد کی ترجمانی خونی اشک سے جس اللہ کے بندے نے کی وہ ایک مسند نشیں ہے۔

ع۔ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔

ایک ایسی عالم گیر شخصیت کا بیان کچھ لحاظ سے بعید ہے۔ نظر ایک ہے۔ جلوے

سینکڑوں ۔ جگر ایک ہے تیر ہزاروں ۔ دل ایک ہے اور درد لاکھوں ۔ وائے قسمت ؎

دامانِ نگاہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

طوالت پسند نہیں ۔ عشاق برسوں کے درد ایک آہِ سرد سے ظاہر دیا کرتے ہیں ۔ ع ۔ داستان نیاز دعاشقی ختم ہے ایک آہ میں

اقبال مصلح دنیا ہے لیکن مسلم ہونے کی حیثیت سے مسلم کے درد کا مظاہرہ زیادہ گرم نالوں سے کیا ہے اور کیوں نہ کرتے ——— مسلم کی وہ سرسبز کھیتی جس سے دنیا نے خوشہ چینی کی تھی ۔ ویران ہوگئی ۔ وہ گلزار جس کی عطر بیزی سے تمام عالم معطر تھا ۔ کسی خزاں کی بھینٹ چڑھ گیا ۔ وہ دل جو گہر ہائے اسرار کے دفینے تھے ۔ خرابۂ یاس و حرماں ہیں ۔

ع ۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا ۔

لیکن اربابِ صدق و صفا اور محبانِ ملک و ملت سے قدرت اپنی دنیا کو زیادہ دیر تک خالی نہیں دیکھ سکتی ۔ سورج کی تابانی اور ستاروں کی جگمگاہٹ دنیا کی رونق کیلئے کافی ہیں جب تک ان نیاز مندانِ حق اور بے نیازانِ دنیا کے دل سے نورانی شعاعیں ان کرنوں کا ساتھ نہ دیں ۔ ایک سطحی نظر والا کہتا ہے ۔ کہ یہ مذکورہ مرتبہ سلاطین روحانی سے متعلق ہے ۔ مگر پوچھتا ہوں ۔ کہ اگر اقبال کے کلام سے ہم "شاعری جزویست از پیغمبری" کے معترف نہ بھی ہوں ۔ اس حقیقت سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ ؎

سر خدا کہ عارف و زاہد بکس نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

ہاں ہاں ہمیں یقیناً اس امر کو تسلیم کرنا پڑتا ہے ۔ کہ اقبال ایک حقیقت شناس رہبر ہے ۔ ان کا کلام ایک مجدد اور موحد کا پیغام ہے ۔ جس کا خاصہ جاگتوں کو منزل پہ پہنچانا اور غفلت کی نیند والوں کو بیدار کرنا ہے ۔ بلکہ کہیں اس سے بڑھ کر ۔ ؎

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

ہم دیکھتے ہیں کہ جب بارش ہوتی ہے ۔ تو زمین سے سبزہ اگتا ہے ۔ جب سورج نکلتا

ہے تو گرمی محسوس ہوتی ہے۔ اس کو نیچر کا عمل کہتے ہیں۔ اور اس قدرتی عمل کی خاصیت کبھی نہیں بدل سکتی۔ اسی طرح جب اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہاں بھی ایک خدائی قانون قوموں کے بنانے اور بگاڑنے میں پوری رفتار سے کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کہ جب کسی قوم میں شخصی اصلاح شخصی جدوجہد اور ذاتی اعتماد نہیں رہتا۔ تو اس قوم کی رفتار میں کوتاہی پرواز میں پستی آجاتی ہے۔ غلامی کی زنجیریں گلے میں پڑجاتی ہیں۔ اور پھر حاکم قوم یا جابر حاکم کو ہم ظالم خونخوار بھی نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اس قوم پر لعنت بھیجنی پڑتی ہے۔ جس نے خود اعتمادی اور خودداری کی زندگی چھوڑکر غیروں کی پناہ میں اپنی امید کے پودے لگائے ہے

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو　　مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

یہی اقوام کے بننے اور بگڑنے کا اصل راز ہے۔ اور اقبال مرحوم کے پیغام کی صحیح ترجمانی جن ارباب سلیم الطبع کو اقبال کے گلستانِ ادب سے گزر نصیب ہے وہ جانتے ہیں۔ کہ اس گلزار کی پتی پتی پر یہی پیغام کندہ ہے ہے

پھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکر درماں میں　　یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنی مرہم کو

ہاں ہاں دوسروں کا سہارا سہارا نہیں دھوکہ ہے اغیار کی حفاظت میں پناہ نہیں۔ بلکہ تباہی ہے۔ جو اپنا محافظ آپ نہیں۔ اسے کون بچائے۔

ع۔ کہ جن کو ڈوبنا ہو۔ وہ ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں۔

اصل سہارا خدا کی امداد ہوا کرتی ہے جو مومنوں کے دلوں میں پوشیدہ ہے۔ عالی ہمم لوگوں کے لئے کامیابی کا راستہ وہ ہے جو مصائب سے گھرا ہو۔

اصلی راحت وہ ہے جو بے قراری کے بستر پر نصیب ہوتی ہے۔ اقبال کو جو لذت انتظار و امید میں ہے وہ وصال میں نہیں۔ ہے

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھکر ہے فراق　　وصل میں مرگِ آرزو۔ ہجر میں لذتِ طلب

انسان کے لئے حقیقی شرف جوہر ذاتی اور خود حاصل کردہ علم اور عمل ہے نہ غیروں کی امداد ہے اور نہ اسلاف کی روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرور باطل۔ ارباب ہمت نے اپنی راہ خود نکالی ہے اور اپنی عظمت و رفعت کی تعمیر صرف اسی سامان سے کی ہے۔ جو خود ان کا اپنا تیار کیا ہوا تھا۔

"مور نے کہا کہ میرا چمن میرے ساتھ ہے۔ باغ و بہار کا محتاج نہیں"۔ نادر شاہ کہتا

تھا "میری کھیتی کا بیج میرے بازو میں ہے" اور جب شجرہ نسب پوچھا گیا۔ تو نادر شاہ بن شمشیر بن شمشیر۔ بن شمشیر . . . . . . خدا بخشے اقبال کو ؎

پریشاں شو اگر لعلے زمیراث پدر خواہی کجا عیش بروں آوردن لعلے کہ در سنگ است

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک قول مجھے نہیں بھولتا "جوانمرد یہ نہیں دیکھتا کہ دنیا کیا کیا کر چکی ہے جس سے وہ دامن بھر لے۔ بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ دنیا سے کیا کیا نہ ہو سکا۔ جس کو وہ پورا کر دے"

علامہ مرحوم نے کس خوبی سے یہ مضمون ادا فرمایا ؎

نگاہ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شہباز نہیں

"چلتے رہنے اور بڑھتے جانے کا نام کامیابی ہے۔ بیٹھ رہنے اور آرام کرنے کا نام ناکامی"!
اور کامیابی کی جستجو میں مٹ جانا بھی کامیابی۔ غازی غازی ہے۔ شہید کے مرتبے بھی جانیئے ؎

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار گردد

اے قوم تیرا جہاز بھنور میں ہے ... سخت اندھیری رات سر پر۔ اور ناخدا ہراساں ہے اٹھ اپنی خبر لے۔ اگر زمانہ تیرا مخالف ہے تو پرواہ نہیں۔ اگر اسباب کار فراہم نہیں تو تو خود پیدا کر ؎

چہ باید مرد را۔ طبع بلندے مشربے نابے
دلے گرمے۔ نگاہے پاک بینے۔ جانے بیتابے

(غلام قادر آزاد تونسوی متعلم نھر دایہ)

طعنِ اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے؟

تھے عشاق ۔ گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے!

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں؟

اے خوش آں روز کہ آئی بعد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی! (اقبال)

خدمتِ خلق اور اقبالؒ

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں ان کا بندہ بنوں گا جنکو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا — اقبالؒ

خداوند تعالےٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات کے لقب سے خلیفتہ الارض بنایا تاکہ اپنی بزرگی و برتری کا ثبوت دے۔ مگر افسوس بعض ظلم و ستم پر کمر بستہ ہو گئے اور بعض عیش و عشرت میں غرق۔ بعض عبادت میں مشغول ہوئے تو بعض نے راہ راست چھوڑ کر گمراہی اختیار کی کیا انسان کی پیدائش کا مفہوم اور مقصد یہی تھا؟

نہیں۔ نہ ہی عیش و عشرت اور نہ ہی صرف عبادت بلکہ خدمتِ خلق۔ یعنی مخلوقِ خدا سے اُنس و پیار اور الفت و محبت کا سلوک اور برتاؤ۔

علامہ اقبالؒ اللہ تعالےٰ کے ان عزیز مقبول اور نیک بندوں میں سے تھے جن کا دل جذبہ خدمت سے بھرا ہوا تھا۔ جن کی نظرِ فراست میں خدمت کا درجہ عبادت سے بڑھ کر تھا، جنہوں نے انسانوں سے انس و پیار۔ الفت و محبت اور ہمدردی اور دلجوئی کی زندگی بسر کی۔ اور دوسروں کو بھی خدمتِ خلق کی طرف توجہ دلائی۔

دنیا میں لاکھوں ایسے نیک انسان موجود ہیں جنہیں یادِ الٰہی میں دن رات مصروف دیکھتے ہیں اور ہزاروں ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے بیابانوں اور ویرانوں میں عبادتِ الٰہی کا بہترین گوشہ اختیار کر لیا ہو۔ لیکن ایسے پارساؤں اور بزرگوں کی عبادت کس کام کی۔ جبکہ ان کے بھائی بھوک سے مر رہے ہوں۔ ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہوں۔ اور عدل و انصاف سے محروم ہوں۔ غرضیکہ یہ ایسے مناظر ہیں جن پہ انسانیت خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

علامہ اقبالؒ ایسے لوگوں کی عبادت کو خود غرضی پہ موقوف سمجھتے تھے۔ جن کو ہمیشہ صرف اپنی "میں میں" کا خیال رہا اور بس۔ اور نہ ہی اقبال ایسے لوگوں کو محبت و پیار کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

اقبالؔ نے صرف ان جواں مردوں کی غلامی کا دم بھرا۔ جنہوں نے اپنی زندگی خدمتِ خلق

اقبال اور اس کی شاعری

در دیدۂ معنی نگراں حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیغمبر نتواں گفت

اقبال ایک جلیل القدر مذہبی انسان ۔ بلند ترین شاعر۔ بزمِ ادب کا روشن چراغ ۔ عزت و اقبال کا تاج ۔ خودی کا پیامبر۔ آسمان سیاست کا آفتاب تاریخ فلسفہ اور تصوف کا ایک جید عالم۔ شمع رسالت کا پروانہ اور دین محمدی کی ترقی کا دیوانہ ہے ۔ وہ دنیا کا "ٹمسر" اور علم و ادب کا ڈاکٹر ہے ۔ اُسکے کلام میں لطف پاکیزگی اور الفت ہے ۔ وہ ایک شاعر ہستی ہے جس کی شاعری سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکی ہے ۔ اس کے دل میں درد ہے عشق ہے ۔ اس کے شعروں میں "لہو" "آگ" اور "زندگی" ہے ۔ اس کی شاعری تغزل بھی ہے ترنم بھی ہے ۔ اس کے نغمے حیات روح پرور وہ مفسر فطرت اور مصور فطرت ہے ۔ . . . .

یہ لکھ چکنے کے بعد وہ خود ہی آکر اپنے اشعار کی تعریف کرتا ہے ۔ ؎

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھکو مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

شاعر کو اپنے بلند مرتبے کا احساس ہے ۔ وہ اپنے آپ کو پیغمبر فردا کہتا ہے ۔

من نوائے شاعر فردا استم

وہ اپنے رس بھرے ترانوں سے سوتوں کو جگاتا ہے اور جاگتوں کو درس حیات دیتا ہے ۔ عالموں کو عمل کی تلقین کرتا ہے مدبروں کو باریک نکات بیان کرتا ہے ۔ اس کے ہر گیت کو ہر ہندوستانی اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے نوجوان اس کو وردِ حیات بناتے ہیں ؎

سُن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

"اقبال" بلند ہمتی کا سبق دیتا ہے ۔ انسان کسی حالت میں شک و یاس کو پاس نہ پھٹکنے دے وہ یاس اور حزن کو ام الخبائث اور قاطع حیات قرار دیتا ہے کٹھن سے کٹھن مشکل میں نہ خود مایوس ہوتا ہے نہ دوسروں کو مایوس ہونے دیتا ہے ۔ وہ ایسے موقعوں پر سر رشتہ امید کو آہنی پنجے کی گرفت میں لیتا ہے ۔

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار فتح کامل کی خبر دیتا ہے میرا جوشِ کارزار

وہ ہمیں یقین دلاتا ہے کہ ایسا گلشن (مراد گلشن حیات) جو بادِ سموم کی نظر ہو چکا ہو جس کی پتیاں خشک ہو کر منتشر ہو چکی ہوں پھر سرسبز اور شاداب ہو سکتا ہے۔

ع۔ "پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ"

پھر فرماتے ہیں۔

برگ سبزے کز نہال خویش ریخت از بہاراں تار امیدش گیخت
درخزاں اے بے نصیب از برگ و بار از شجر مگسل با اُمید بہار

فرماتے ہیں کہ ہر کوشش کے ساتھ دامنِ امید کو بھی مضبوطی سے پکڑے رکھو۔

ورطلب کوش و میدہ دامنِ اُمید ز دست دوتے ہست کہ یابی سرراہے گاہے

اقبال کے نزدیک آرام کی زندگی موت کے برابر ہے۔ وہ سوتے رہنے کو خودکشی۔۔۔ لیٹے رہنے کو زہرِ ہلاہل۔۔۔ بیٹھے رہنے کو سمِ قاتل۔۔۔ کھڑے رہنے کو دشمنِ جان۔۔۔ اور اس طرح چلنے پھرنے کو بھی موجب نقصان سمجھتا ہے۔ وہ تو دن رات دوڑنے اور بھاگنے کا قائل ہے۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست جز بعلم انفس و آفاق نیست
میا را بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است
ابدریا غلط و با موجش در آویز حیات جاوداں اندر ستیز است

اقبال انقلاب کا حامی ہے اور چاہتے ہیں کہ انسان کو ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہنا چاہیئے۔

دمادم نقشہائے تازہ ریزد بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است بخاکِ تو شرار زندگی نیست

دیکھئے اس نیچے شعر میں کیا سربستہ راز حیات پنہاں ہے۔ سچ پوچھو تو سارے فلسفہ حیات کا نچوڑ اسی میں ہے۔

اگر ز رمزِ حیات آگہی مجوئے دگر دے کہ از خلشِ آرزو پاک است

وہ سوتے ہوؤں کے کان میں کہتا ہے کہ اُٹھ! اور کمر باندھ کر اپنے کام میں سرگرم

ہو جا۔ نہیں تو پھر "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

اے کہ از تاثیر افیون خفتہ عالم اسباب را دوں گفتہ
خیز و واکن دیدۂ مخمور را دوں مخواں ایں عالم مجبور را

اقبال کہتا ہے کہ زندگی ایک بیش بہا متاع ہے جس کو بیکار ضائع کرنا مصلحت سے بعید اور سخت نقصان دہ ہے۔

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

اقبال کا نظریہ ہے کہ دکھ اور مصائب تو انسان کی تکمیل اور بقائے دوام کا باعث ہیں۔ اس لئے وہ ترقی کی راہ میں جو مشکلات حائل ہوں ان سے سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرے نہیں تو وہ نوکِ زبان پر شکوہ وغیرہ لانے کا حقدار نہیں ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کرلے
نہیں جنس ثواب آخرت کی آرزو مجھکو وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا خسارے میں
پر سیدم از بلند نگاہے حیات چیست گفتا مے کہ تلخ تر او نکو تر است

پھر فرماتے ہیں۔ پتھر سے "لال" لانے میں جو خوشی ہوتی ہے وہ ورثہ میں ملے ہوئے میں نہیں ہوتی ؎

پشیماں شو۔ اگر لعل ز میراث پدر خواہی کجا عیش برون آوردن لعلِ کہ در سنگ است

اس کو ہمارے بلند مرتبے کا احساس ہے اور کہتا ہے جبرائیل تو در کنار عرش ربی تک رسائی ہو سکتی ہے۔

در دشت جنون من جبرئیل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

وہ ہمیں تلقین کرتا ہے اور اصلیت سے آگاہ کرتا ہے کہ تم ہی سب کچھ ہو"

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے
اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
خدا لم یزل کا دست قدرت تو زبان تو ہے یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

وہ راستہ بھولے ہوؤں کا خضر راہ بنتا ہے۔ لاچاریوں اور مجبوریوں کا علاج بتاتا ہے وہ خفیف طاقتوں کو کام میں لانے کا بہترین گر بتاتا ہے۔ وہ انسان کو اسمانی مخلوق سے

پر تر سمجھتا ہے اور تمام کائنات کو اس کے مطیع خیال کرتا ہے۔ ان کو آسمانوں کی تسخیر کے لئے اکساتا ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر

نہ پوچھو میری وسعت کو زمین سے آسماں تک ہے وہ مشت خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہیں

مانگ اور ہمیشہ مانگتا رہ اور اگر کچھ مراد پوری ہو جائے تو اس پر ہرگز قانع نہ ہو کیونکہ

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

دفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری

اس طرح وہ خاموش پسند زندگی کے قائل نہیں وہ فرماتے ہیں کسی چیز کی تلاش میں بھاگتا رہ اور فریاد کرتا رہ حتیٰ کہ تیری فریاد آسمان تک پہنچ جائے اور تلاش کرتے کرتے تمہیں خدا مل جائے

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

اقبال تمام مذاہب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ محبت سے خالی دلوں کو درسِ محبت سکھاتا ہے اور یگانگت کا سبق دیتا ہے

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

وہ ایک ایسی دنیا قائم کرنا چاہتا ہے جس میں محبت اور مساوات کی حکومت ہو۔ وہ امتیازِ ملت و قوم کے تعصب اور فرقہ بندی کے سخت خلاف ہیں۔

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

نہ افغانیم نہ ترک تتاریم چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

حقیقت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو یا ناری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

وہ بنی نوع انسان سے محبت اور ہمدردی کرتے کرتے بے جان چیزوں سے بھی محبت کرنے لگ جاتا ہے۔

صدمہ آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر — اشک بنکر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر

اقبال کا دل یہ دیکھ کر بہت دکھتا ہے کہ تہذیب حاضر کی ظاہرا چمک دمک سے نوجوان متاثر ہو کر تخریب تہذیب مشرق میں لگ گئے ہیں اور انہیں آگاہ کرتے ہیں کہ "ڈھول کے اندر پول" کے سوا اور کچھ نہیں۔ ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ اپنی دور رس نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ مغربی تعلیم جو بنی نوع انسان کے دماغ پر مسلط ہو رہی ہے وہ اقوام کی مادیت کے لئے پیام موت ہے۔ وہ مغرب کی تہذیب و تمدن کو "خوشگواری خرد" سے تعبیر کرتا ہے۔ ؎

قدحے خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا — ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر نہ دارد

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخ نازک پہ آشیاں بنے گا ناپائدار ہوگا

وہ اسلام اور مشرقیت کا ترجمان بن کر جذبات اسلامی سے مست نظر آتا ہے۔

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا — وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہا

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل — اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

گر تو میخواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بقرآن زیستن

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں — یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

"من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا)

اس لئے انسان سے مخاطب ہو کر ڈاکٹر صاحب نرجبہ فرماتے ہیں کہ اپنی حقیقت کو پہچان ضعیف نہ بن دست التجا نہ پھیلا۔ کیونکہ اس سے خودی کمزور ہوتی ہے۔

ع۔ دریا میں حباب آساگوں پیمانہ کر

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں

ع۔ خودی کو نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اور ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ اگر ہر کام میں اسی طرح لاپرواہی اور غفلت کرتے گئے تو

وہ ایام دور نہیں جب ؎

اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی آئیں گے غسّال کابل سے کفن جاپان سے

آپ فرماتے ہیں کہ جو دنیا اور آخرت میں سرخرو ہونا چاہتے ہیں انہیں چاہئے ذات پات کی بندشوں کو توڑ کر "عمل" کرنا سیکھیں کیونکہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات لذتِ تخلیق قانونِ حیات

اقبال بے عمل پیروں (جن کا . . . لگا رکھے ہوں جن کا کام حجروں میں بیٹھ کر تسبیح کے دانوں کے گننے کے سوا اور کچھ نہ ہو اور ان کے ہر فعل و قول میں دکھاوا ہی دکھاوا ہو جنہوں نے دھوکے اور فریب سے نذرانے وصول کر کر کے اپنے گھروں میں دولت کے انبار کر رکھے ہوں۔ کے خلاف ہیں وہ انہیں سوداگرانِ دین فروش سے کم نہیں سمجھتے۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی ! گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

برخلاف اس کے اگر انہیں ایسے پیر باعمل مل جاویں۔ زر تو زر پھر جان تک قربان کرنے کو تیار ہیں ؎

زر کیا ہے سر بھی دیدیں مریدانِ باصفا علم و عمل کا وصف کسی "پیر" میں بھی ہو

وہ ہندوستان کو ایک غلام آباد ملک دیکھ کر کڑھتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

موت اگرچہ دیکھنے میں ایک مہیب اور خوفناک چیز معلوم ہوتی ہے مگر صاحب موصوف تو اس سے بے خوف اور نڈر ہیں اور فرماتے ہیں۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی ...

موت کی لیکن دل ناداں کو کچھ پروا نہیں شب کی خاموشی میں جز ہنگامہ فردا کچھ نہیں

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مسکراتے ہوئے موت کو لبیک کہا۔ **محمد شفیع الرحمن خطا**

متعلم ہفتہ ڈایر

اتنیں گلشن ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں اور محروم ثمر بھی ہیں۔ خزاں دیدہ بھی ہیں

سینکڑوں نخل ہیں۔ کاہیدہ بھی۔ بالیدہ بھی ہیں سینکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں

نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا (اقبالؔ)

اقبالؒ (سوانح حیات)

حکایت از قدآں یار دلنواز کنیم
بہ ایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

ایرانیوں کا ناز بجا کہ سعدی شیرازی جیسے گوہر یکتائے روزگار اس سرزمین میں پائے گئے۔ عربوں کا فخر بجا کہ متنبی جیسے فصیح اللسان دنیا بھر کو عجمی کہنے کی جرأت کر گئے۔ انگلینڈ کی نترا کی بیک۔ کہ شیکسپئر جیسے جادو بیان اپنے کلیے پڑھا گئے۔
بے انصافی نہ ہوگی۔ اگر ہندوستان بھی علامہ اقبال کو پیش کرتے ہوئے دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کرے۔

بفگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے را مے پرستند

گل کو ہے نازِ نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں نازو نزاکت والے

آپ جانتے ہیں کہ ایک چیز خوبصورتی ہے۔ اور ایک چیز اس سے بڑھ کر ہے۔ جس کے لئے زبان کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن آنکھ سمجھتی اور ذوق پہچان لیتا ہے۔
خواجہ حافظ نے اس کو آن کے لفظ سے تعبیر کیا ہے

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اور پھر جب بالکل مجبور ہو گئے تو اشارہ کر کے چھوڑ دیا

ایں کہ مے گویند آں بہتر ز حسن
یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

تو وہ ایک چیز ہے "آنے دارد" جس کے لئے صرف کسی کا خوبصورت ہونا ہی کافی نہیں۔ خوبصورت تو ہزاروں ہوتے ہیں۔ مگر آن رکھنے والے چشم و ابرو لاکھوں خوباں روزگار میں ڈھونڈھے نہیں ملتے۔ اور اگر مل جائیں تو سمجھنا چاہئے۔ کہ قدرت کی غیر متوقع فیاضی بلکہ اسراف ہے" امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد" تو بمصداق اس کے متذکرہ شعرا یقیناً حسین تھے۔ اور بعض کے حسن رعنائی پر تو ایک زمانہ شیدا ہوا ہے۔ مگر علامہ اقبال وہ حسین ہیں۔ کہ جن سے کتنے ہی خوبانِ روزگار دلربائی اور دلآویزی کے بھید اور نکتے سیکھیں گے

خوش دلکش است قصہ خوبانِ روزگار
تو یوسفی و قصہ تو احسن القصص

۱۸۷۵ء میں آپ فانی دنیا میں تشریف لائے۔ جائے تولد کا فخر قصبہ سیالکوٹ کو حاصل ہے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کیا۔ یہاں انہیں شمس العلماء مولوی سید میر حسن جیسے جید عالم کے فیض تربیت سے مستفید ہونے کا موقع مل گیا۔ عربی۔ فارسی کا صحیح مذاق اقبال میں انہوں نے پیدا کیا۔ انہیں دوران میں ان کی شاعری کا قدم مقبولیت کی طرف بڑھا۔

بی۔ اے کے لئے لاہور تشریف لائے یہاں دہلی اور لکھنؤ کے بعض شعرا سے تعلق میں آئے اور ساتھ ہی انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر آرنلڈ جیسے استاد کامل نصیب ہوئے۔ ان کی صحبت کا ان پر نمایاں اثر ہوا۔ اردو نظموں میں نئے فلسفیانہ مضامین سے روشناسی اسی کے اثر کا نتیجہ ہے۔

ایم۔ اے کے بعد آپ اورنٹیل کالج بعد ازاں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر رہے۔ مگر یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا آخر فلسفہ و قانون اور تحقیقاتِ علم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے بانگِ درا میں اس مضمون پر فرماتے ہیں۔

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل ہوا ہے صبر کا منظور امتحان مجھکو
چلی ہے لیکے وطن کے نگار خانے سے شرابِ علم کی لذتِ کشاں کشاں مجھکو

تین سال تک یورپ میں رہے کیمبرج یونیورسٹی سے ڈگریاں حاصل کیں۔ پھر جرمنی میونخ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مشہور عالم کتاب فلسفۂ عجم لکھنے پر حاصل کی ۱۹۰۸ء میں واپس تشریف لائے۔ اور ہندوستان نے یوں خیر مقدم کیا

ہے آمدِ مسرت اقبال تیری آمد
خوشیاں ہیں اہل دل میں عیدیں ہیں اہل فن میں

اب آپ نے دل کھول کر رنگ اشعار میں خونِ جگر کے موتی پرو کر ملک و قوم پر نثار کر دیئے سب سے پہلی غزل جو آپ نے پڑھی۔ اس کا ایک شعر ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے قطرے جو تھے میرے عرق انفعال کے

خیر یہ کہانی دراز۔ نہ ان کے کلام سمجھنے کی توفیق نہ تبصرہ کی ضرورت المختصر کہ آپ نے اپنی تمام عمر ملک و قوم کی خدمت میں خون کے آنسو بہا کر بسر کی۔

آپ کا کلام ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہا۔ بلکہ تقریباً دنیا کے شعرائے ہمعصر کا

بیزار سر دکیا۔ آپ کی مشہور تصانیف بانگِ درا۔ بالِ جبریل۔ ضربِ کلیم۔ زبورِ عجم۔ جاوید نامہ۔ ارمغانِ حجاز۔ اسرار و رموز۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق۔ مسافر۔

آپ کا سارا پیغام بلند ہمتی اور اولوالعزمی اور خودداری پر مشتمل ہے۔ نئے فیشن اور نئی تہذیب کی تقلید سے زبردست اختلاف ہے۔ چنانچہ بالِ جبریل میں اپنے فرزند جاوید کو یوں مخاطب فرماتے ہیں۔ ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح شام پیدا کر

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

میرا طریقہ امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

بہرحال ہر ایک شخص تقریباً ان کی زندگی سے واقف و آگاہ ہے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ یا عیاں را چہ بیاں۔ لیکن افسوس ہے ؎

رونا کہاں ہوا مجھے دل کھول کر نصیب
وہ آنسوؤں میں نوح کا طوفان آ گیا

شاید قدرت نے بدقسمت ہند کو آپ کی خدمت کا اہل نہ سمجھا اور ۱۹۳۸ء کو اپنے ہاں واپس بلا لیا

ع۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

دنیا کچھ سمجھے لیکن میرا ایمان ہے۔ کہ علامہ اقبال براہِ راست قدرت کے ہاں عروج دارِ تعلقے ملک و ملت کے لئے اپیل لے گئے ہیں جیسا کہ ان کا وعدہ ہے۔ ؎

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

ہم چشم براہ ہیں کہ کب زندگیِ جاوید میں واپس آ کر اپنے پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ ؎

انتظارِ دید میں آنکھیں ترستی ہیں میری
گو میری آنکھیں تیرے دیدار کے قابل نہیں

(محمد نواز وہوی۔ سیکنڈ ایئر کلاس)

امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غربا کے دم سے

مسجد میں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیوں کر ہو

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

(اقبالؒ)

اقبال اور نوجوان

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختۂ شام و سحر پیدا کریں
(اقبالؒ)

یہ قانونِ قدرت ہے کہ دنیا میں صرف وہی قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جن کے نوجوان زندہ ہیں یعنی قوموں کی حیات نوجوانوں کے جوشِ عمل میں مضمر ہے۔ جس قوم میں نوجوان مردہ دل۔ کمزور طبیعت۔ ڈرپوک اور بزدل ہوں۔ ایسی قوم کو دنیا میں زندگی کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اور جس قوم کے نوجوانوں کے رگ و ریشہ میں تڑپ۔ بیداری۔ شجاعت اور طاقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے آئینہ عالم سے واضح ہے کہ وہ قوم ہمیشہ حکمران بن کر اپنا سکہ چلاتی ہے

مسلمانوں میں بھی جب تک ایسے نوجوان پیدا ہوتے رہے تو غیرت۔ خودداری۔ اخوت اور عزت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن جب خود بگڑنا چاہا تو ذلت و خواری اور غلامی کی زندگی بسر کرنی پڑی۔

مگر یہ سب کچھ کیونکر؟

انقلابات اور گردشِ زمانہ کی وجہ سے کم نظر لوگوں نے نوجوانوں کو گمراہ کر دیا اور صحیح اسلامی تعلیم نہ دی۔ جن سے مسلمانوں کے دل مردہ اور تاریک تر ہوتے چلے گئے۔ اور یہ سب کچھ دورِ حاضر کے ملاؤں۔ صوفیوں اور پیروں کی بدولت ہوا۔ اسی لئے تو علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
(اقبالؒ)

حقیقت میں نوجوان شاہین تھا۔ لیکن افسوس نوجوانوں نے اپنی عظمت و بلندی کو بنظرِ غور نہ دیکھا اور ان نادانوں نے آج سے تیرہ سو برس پہلے کی اسلامی زندگی کی حقیقت اور اصلیت معلوم نہ کی۔

ہمارے نوجوان فرنگی تہذیب کے پیچھے دیوانہ وار بھاگے پھرے اور نتیجہ یہ کہ دنیوی اور روحانی ترقی کی راہوں سے محروم رہے۔ گویا "نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے" ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شہبازی
(اقبالؒ)

افسوس نفسانی خواہشات کی خاطر نوجوان عیش وعشرت کے دلدادہ بن گئے۔ احکاماتِ شریعت سے روگردانی کی۔ اور روزہ۔ نماز۔ حج۔ زکوٰۃ اور دیگر قوانینِ فطرت کو نظر انداز کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو گئی۔

اقبال کہتا ہے جب تک نوجوانوں میں زورِ حیدری اور استغنائے مسلمانی پیدا نہ ہو اور جب تک ان کے دل کا دیا نورانی تجلیات سے روشن نہ ہو نوجوان خاک کا ایک ڈھیر ہے اور مردوں سے بھی بدتر۔

اقبال نے سب سے پہلے نوجوان کو بیداری کا سبق دیا۔ مگر کیسی بیداری؟ گویا ؎

یہ خاموشی کہاں تک! لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
(اقبالؒ)

علامہ مرحوم چاہتے تھے کہ نوجوانوں میں اس قدر جلدی انقلاب رونما ہو تاکہ آج ہی مسلمان غلامی کی زنجیریں توڑ کر بامِ عروج تک پہنچیں۔ اس لئے آپ نے اپنی قوم کے نوجوانوں کو مخاطب کیا اور انہیں عمل کے رستہ پر گامزن ہونے کے لئے ہمت دلائی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے مستقبل کی شاندار عمارت صرف انہی کے ہاتھوں سے تعمیر ہو سکتی ہے۔

اقبال نے نوجوانوں کو دعوتِ عمل دی تاکہ نوجوان دنیا میں اپنی مردہ قوم کو زندہ کر سکیں اور دین و دنیا میں سرخروئی حاصل کریں۔ اقبال نے ہمیشہ مشکلات اور تکالیف کی زندگی بسر کرنے کو عیش وعشرت کی زندگی پر ترجیح دی۔ آپ مجاہد تھے اور مجاہدانہ زندگی بسر کرنے کے حامی تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

از گلِ آدمے تعمیر کن — آدمے را عالمے تعمیر کن
خیز و خلاقِ جہاں تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
زندگی کشت است و حاصل قوت است — شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است
از رموزِ زندگی آگاہ شو — ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو

اقبال نے نوجوانوں کو جفاکش اور مردِ میدان بننے کی ترغیب دی۔ تاکہ اگر اپنے بزرگوں کے حقیقی جانشین کہلوانے کے مستحق بننا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ؎

آں عزمِ بلند آور آں سوزِ جگر آور
شمشیرِ پدر خواہی بازوئے پدر آور

کی صحیح تفسیر بن کر دکھائیں۔

علامہ مرحوم خود دار تھے اور انہوں نے نوجوانوں کو بھی خود داری کی تعلیم دی تاکہ مسلمان مشکلات اور مصائب کا ایک سخت چٹان بن کر مقابلہ کر سکے۔ اور مسلمان کو مٹانے کی اغیار کی تدابیر نقش بر آب ثابت ہوں۔

اقبال کی نظرِ فراست میں نوجوان ایک عقاب کی مانند ہے جو بے خطر اور نڈر کرہ ہوائی میں پرواز کرتا ہے۔ نوجوانوں کو بھی اپنے دلوں میں عقابی روح پیدا کرنی چاہئے۔ تاکہ دنیا میں عزت اور آبرو سے زندگی بسر کرنے کے قابل ہوں۔ جن نوجوانوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہوں کیا ان کے شایانِ شان ہے کہ ان میں نہ جذبۂ خدمت ہو اور نہ دردِ ملت۔

نوجوانو! کب تک خوابِ غفلت میں رہو گے۔ دنیا میں دیگر قومیں نہایت ہی سرعت سے رُو بہ ترقی ہیں۔ اگر کچھ ہمت اور بیداری ہے۔ تو اس کا ثبوت دو۔ ورنہ غلامی اور ذلت کے جینے سے ڈوب کر مرجانا ہزار درجہ بہتر ہے کیونکہ ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
اقبالؒ

واحد بخش قلندر
متعلم بی۔ اے

شلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا　　رخت بر دوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا　　نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری　　مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری　　تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اقبالؒ

اقبال کی شاعری

ادب زندگی کے ہر رخ سے متاثر ہوتا ہے۔ اس میں زندگی کے تمام ظاہر اور پوشیدہ تفصیلیں کسی نہ کسی طرح منعکس ہو جاتی ہیں۔ یہ عکس قوم کی ذہنیت کا عکس ہوتا ہے۔ جب کسی غلام اور گری ہوئی قوم میں آزادی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جب وہ ایک طویل مدت پستی اور ذلت کی گہرائی میں سوئے رہنے کے بعد بیدار ہوتی ہے۔ تو سب سے پہلے جو شئے اس انقلاب سے متاثر ہوتی ہے وہ اس قوم کا ادب ہے۔ اس قوم کے حساس شاعر اور ادیب اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں۔ تباہی اور بربادی کا بھیانک منظر دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے ہیں پھر اپنے حیات آفریں نغمات قوم کے مردہ جسم میں تازہ روح پھونک دیتے ہیں۔

اسی طرح جب ایک فاتح اور برسراقتدار قوم اپنی شوکت و عظمت کھونے لگتی ہے اور اس میں زوال کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں تو سب سے پہلے اس قوم کا ادب زوال پذیر ہونے لگتا ہے اس کے بعد تباہی کے بادل قوم کی زندگی پہ محیط ہو جاتے ہیں۔ پہلے ذہنی پستی کا دور آتا ہے پھر عملی قوتیں بھی اس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ انحطاط کا سیلاب آتا ہے۔ اور اس قوم کی آزادی، بلندی، خودداری غرض ہر وہ چیز کو جو اس کے عروج میں معاون اور مددگار ہو بہالے جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ہندوستان کی مرکزی قوت تقریباً ختم ہو چکی تھی اور قوم پستیوں کی طرف جا رہی تھی۔ مغل شہسوار کی تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ فوجی زندگی عیش کی داستان میں بدل گئی تھی۔ اور قوائے عمل تقریباً زائل ہو چکے تھے۔

۱۸۵۷ء کے غدر نے ہندوستانی مسلمانوں کی رہی سہی طاقت اور وقار کو یکسر مٹا دیا اور وارثانِ تاجِ تیموری کو سات سمندر پار بسنے والے فرنگیوں کا سیاسی غلام بنا کر ان کی ہر قسم کی آزادی اور بہبودی کے تصورات کو خوابِ پریشاں بنا کر رکھ دیا... مگر چند سال کی گھٹا ٹوپ تاریکی کے بعد پھر ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے لگی اور سب سے پہلے حالی مرحوم نے اپنی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں قوم کو جاگنے کے لئے آواز دی۔

اور پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اکبر الہ آبادی نے بھی اس ساز کو اٹھا لیا۔ اگرچہ ان دونوں بزرگوں کے گیت جدا جدا تھے مگر مقصد ایک ہی تھا۔ حالیؔ کی صدائے دردناک کی گونج اور اکبر الہ آبادی کی دلگداز آواز ابھی فضا میں گونج ہی رہی تھی کہ پنجاب کے دارالسلطنت سے ایک آواز پیدا ہوئی۔ یہ اقبال کی آواز تھی۔ جس میں شباب کا جوش تھا۔ ہنگامے تھے۔ صدائے صور تھی۔ جو ہر شخص کو پیام بیداری دے رہی تھی۔ یہ اقبال کی شاعری کا پہلا دور تھا۔ ابھی وہ نوجوان تھا۔ اس کا دل وطنیت سے لبریز تھا اور وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اس دور میں "خاک وطن کا ہر ذرہ" اس کے لئے دیوتا تھا۔ وہ وطن کا پجاری تھا۔ اور اپنے وطن کو دوسرے ملکوں کی طرح سربلند اور آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ چند سال کے بعد اقبال یورپ مطالعہ کی غرض چلا گیا جہاں اس نے مذہبِ اسلام کے سیاسی عقیدہ کو اپنا لیا اور اس کا پرچار اپنا فرضِ اولیں سمجھا۔ اس کے ساتھ اُن کی شاعری کا رُخ بھی بالکل بدل گیا اب وہ وطنیت کی محدود چار دیواری سے نکل کر شاعرِ اسلام بن گیا۔ اور اپنی آواز کو تمام ممالک اسلامیہ میں پہنچانے کے لئے اس نے فارسی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنا لیا۔ اگرچہ اس کے بعد اقبال نے اُردو میں بہت کچھ کہا مگر فارسی کی طرف ان کا رجحان زیادہ تھا جو تادمِ آخر رہا۔

شاید آج بھی ہندوستان میں چند ایسے حضرات ہوں جو خیال کریں کہ اقبال شاعر نہیں۔ مگر دنیا تسلیم کر چکی ہے کہ وہ شاعر تھا۔ وہ ازل سے شاعرانہ دل لیکر آیا تھا۔ ایک ایسا دل جو حساس تھا۔ اس نے دنیائے ہستی میں قدم رکھتے ہی پہلے وطن اور پھر ملت کے دکھوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا۔ کہ وہ قوم جو کبھی بحرالکاہل سے بحر اوقیانوس تک اپنی حکومت قائم کئے ہوتے تھی جس نے ایران و روم جیسی قاہر سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ وہ قوم آج خود ذلتوں کا شکار ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ دعوتِ عمل لے کر اٹھا۔ ملت اسلامیہ کو ایک درس دینے کے لئے اٹھا۔ اور اس نے مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو پکار پکار کر کہا ؎

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

اس کی آواز کا لبِ لباب یہ تھا۔ "اپنے آپ کو جان اور جان چکے تو راہِ عمل میں گامزن ہو جا
قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح حق پرست اور سخت کوش مسلمان بن جا۔ اور قرآن مجید کی طرف
رجوع کر"۔ یہی پیام تھا جو اقبال اپنی ملت کو دیتا تھا اور فی الحقیقت ملتِ اسلامیہ کے لئے اس
سے بہتر پیام اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ تاریخ کے صفحات پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ جب کبھی
مسلمانوں نے اس چیز کو چھوڑا۔ زندگی کی تمام نعمتیں ان سے چھین لی گئیں۔ اور وہ دوسروں
کے غلام بن کر رہ گئے۔

اقبال نے مسلمانوں کو خصوصاً اور دنیائے انسانی کو عموماً درسِ خودداری اور زندگی دیا ہے
اس کے حیات آفریں نغمے سُن کر رگِ سنگ میں بھی لہو کی گردش پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال نے دنیا
کو تباہی اور بربادی کے عمیق گڑھے سے جس کی طرف موجودہ مغربی تہذیب لئے جا رہی ہے
گرنے سے بچا لیا ہے۔ اقبال صرف شاعر ہی نہیں بلکہ قوموں کا مسیحا ہے اور اس کی شاعری۔

ع ۔ شاعری جزو یست از پیغمبری

کی مکمل اور صحیح تصویر ہے۔

ایم۔ اکرام راجپوت
الیف۔ اے سٹوڈنٹ

اقبال کے الفاظ میں پیغام خدا ہے
من سے جو ہوئی ملت مرحوم نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

(سُہیل)

فانوسِ خیال

دور ــــــ بہت دور سے شہنائی کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی ایسی ــــــ جیسے آکاش سے بادل کے ننھے ننھے گالے گر رہے ہوں۔ دھیمی دھیمی اوس پڑ رہی ہو۔ دل اس جانب خود بخود کھچا جاتا تھا۔ نغمے میں کس بلا کی کشش تھی۔ اس میں جذب ہو جانے کو۔ سما جانے کو جی چاہتا تھا۔ بارے میں اٹھا اور ارادہ کیا کہ ذرا دیکھوں کہ یہ سرمدی راگ کہاں الاپا جا رہا ہے۔ چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ دیکھا ایک جم غفیر اس نغمے کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے۔ میں نے چند ایک سے پوچھا "بھائی کہاں جا رہے ہو؟ یہ راگ کی آواز کیسی ہے؟" مگر کسی نے بھی جواب نہ دیا۔ ہاں البتہ اگر کوئی بولا بھی تو صرف اتنا کہ خود جا کر دیکھ لو یہ کیف بیان نہیں کیا جا سکتا۔ حاصل کیا جا سکتا ہے اور اگر اس کا ذائقہ ایک دفعہ نصیب ہو گیا۔ تو تمام عمر بھلانے کی سعی پر بھی نہ بھلا سکو گے۔ اس مختصر سی گفتگو کے بعد کچھ دیر تک میری یہ کیفیت رہی کہ ؎

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

حتیٰ کہ ایک صاحب پر نظر پڑی۔ کچھ خیال سا گزرا کہ پہلے کہیں دیکھ رکھا ہے۔ سوچا کہ چلو ان سے پوچھ لوں۔ بہ صورت سوال بنکر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرا خیال غلط نکلا۔ وہ بھی "اجنبی محض" تھے۔ مگر اخلاق میں اوروں سے بہتر تھے۔ فرمانے لگے ؎

ساقی بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

میں نے کہا "بندہ نواز! یہ تو میرے درک و آگہی سے بالاتر ہے" بولے "تو ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لینا۔ سمجھانے سے سمجھ میں آنے والی بات یہ ہے نہیں" اگر سمجھ سکو تو بس اتنا سمجھ لو ؎

ڈھونڈھے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

چنانچہ میں بھی انسانوں کی اس ندی میں چل کھڑا ہوا۔ بھیڑ کی وجہ سے کبھی ندی کے اس کنارے کبھی منجدھار میں اور کبھی پار بہہ نکلتا۔ کچھ دور چل کر راستہ قدرے تکلیف دہ ہو گیا۔ پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ بعض بعض جگہ پھسلاہٹ غضب کی تھی۔ دونوں طرف کھائیاں، گہرے گہرے گڑھے اور عمیق غار تھے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا مقام تھا۔ جہاں کسی کا قدم پھسلا اور گیا۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ہر کھائی پر ایک چھوٹا سا تختہ لگا ہوا تھا کسی پر لکھا تھا۔ "شہرت کی حرص"۔ "کسی پر خود غرضی و خود پرستی" "کسی پر مال و دولت کی لالچ" اور کسی پر "ناعاقبت اندیشی"

ہم لوگ جس قدر راستہ طے کرتے چلے جا رہے تھے اسی قدر راستہ کٹھن ہوتا اور کھائیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے پھر اپنے ساتھی سے پوچھا "بندہ پرور یہ کھائیاں کیسی اور تختے کیوں ہیں؟" کہنے لگے "اوپر اگر پہونچ گئے تو تمام حال روشن ہو جائے گا" نغمہ اور نغنے والا قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ مخلوق آواز میں کھوئی ہوئی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مگر کچھ ایسے بھی تھے جو بیچارے تھک کر راستے ہی میں بیٹھ گئے۔ سفر کی صعوبتیں برداشت نہ کر سکے اور کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی "شوخ چشمی" کی وجہ سے کسی کھائی کی نظر ہو گئے۔

خدا خدا کر کے سامنے ایک مقام نظر پڑا۔ سنگ مرمر کی ایک بارہ دری تھی۔ اس کے پہلے سنگ مرمر کا ایک حوض تھا۔ نیلگوں پانی میں سرخ اور سبز مچھلیاں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں اس کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے تمام عالم سے بے نیاز، سروری نغمے میں مست، آواز تھی۔ کائنات کی تمام رعنائیاں اس کی سادگی پر قربان اور عالم آب و گل کا تمام حسن اس کی صورت پر تصدق ہو رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صورت گر ہستی نے اس "سندرتا" کو خاص فرصت کے لمحات میں گھڑا ہو گا بظاہر وہ مچھلیوں کی شوخی دیکھ رہی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ اپنے مست اور بےخود بنا دینے والے راگ میں خود بھی خود کو بھلا چکی تھی۔ ہر تماشائی ہمہ تن چشم تماشائی اور چشم تماشائی چشم نرگس بنکر رہ گئی تھی۔ اب میری سمجھ میں ان صاحب کا شعر آیا جو مجھے ابتدائے راہ میں ملے تھے۔ میں بھی اس پری پیکر کو دیکھنے میں محو تھا کہ یکایک غلغلہ اٹھا اور خدام ادب نے ہمیں پرے ہٹانا شروع کیا اور کہا "اب وہ لوگ آنے والے ہیں جن کے لئے یہ دربار سجایا گیا ہے اس لئے ذرا ہٹکر کھڑے ہو جایئے تاکہ انہیں بارہ دری تک پہونچنے میں دقت نہ ہو"

اس کے بعد ایک گروہ آیا۔ ان میں بعض صورتیں ایسی بھی نظر پڑیں جو کچھ شناسا سی معلوم ہوتی تھیں لیکن یہاں بولنے کی مجاز کسے تھی اپنے ساتھی سے چپکے سے میں نے پوچھا۔ کیا یہی

وہ لوگ ہیں جن کے لئے یہ تمام اہتمام ہے" ؟ وہ بولے "یہ معزز مہمان ہیں۔ ورنہ مقصود بالذات اور ہی ہیں"۔ چنانچہ اسی طرح یکے بعد دیگرے چھوٹی چھوٹی جماعتیں آتی رہیں۔ کوئی علما کی کوئی شعرا کی کوئی اصفیا کی۔ بارہ دری میں یہ لوگ اپنی اپنی نشستوں پر حسب مراتب بیٹھ گئے۔ لیکن آگے کی چند ایک کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ اور سنا تھا کہ یہ مجلس انہی نشستوں پر بیٹھنے والے حضرات کے لئے منعقد ہوئی ہے اب جو حوض کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو نہ وہ صورت ہے اور نہ وہ شنوائی، نہ تماشا ہے نہ چشم تماشائی میں نے انتہائی تعجب سے اپنے فہیم ساتھی سے پوچھا "حضرت وہ سب کچھ کیا ہوا؟" عمر رسیدہ بزرگ مسکرا کر فرمانے لگے "وارفتۂ تخیل! ا، فریب نظر کے متوالے! راستے کی دقتوں کو کم کرنے کے لئے اور آتش شوق کے عروج کو قائم و سلامت رکھنے کے لئے یہ نغمہ، اور تھکان کو سکون دینے کے لئے وہ حسین صورت تھی اور بس۔ اصلی معراج کمال اس بارہ میں داخل ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اس میں بیٹھے ہوئے ہیں ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جو غیر فانی نام چھوڑ کر آئے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز مٹ جائے گی۔ لیکن قیامت تک ان کا نام نہ مٹ سکے گا۔

خدام اب ہم لوگوں کو چھوڑ کر بارہ دری میں چلے گئے اور اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے ہم نے اس موقعہ کو غنیمت جاننا چاہا کہ جلدی سے دھاگ کر بارہ دری میں گھس جائیں اور اس انجمن کی سیر دیکھیں اسی افراتفری میں میں اپنے ساتھی سے بھی جدا ہو گیا اور انہیں انتہائی تلاش کے باوجود بھی نہ پا سکا۔

اس مجمع کثیر کو یوں دوڑتا دیکھ کر بارہ دری میں سے تمام منتظمین باہر نکل آئے اور ان لوگوں کو باہر کے باہر ہی روک دیا بارہ دری میں داخل ہونا اس قدر سہل نہیں پہلے کچھ کر کے دکھائے پھر تشریف لائیے اور اگر محض تماشا مقصود ہے تو باہر سے بہتر نظر آئے گا۔ چنانچہ ہر دروازے پر ایک دربان مقرر ہو گیا تاکہ کوئی شخص اندر نہ آنے پائے۔ میں اپنے ساتھی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑتا پھر رہا تھا حتیٰ کہ اس در کے سامنے آ گیا جہاں سے کہ اگلی صف صاف نظر آ رہی تھی اتفاق کی بات اس در پر کوئی دربان نہ تھا۔ غور سے چاروں طرف دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس کا دربان برابر والے دربان سے مصروف بہ تکلم ہے میں نے موقع کو غنیمت جانا۔ خیال ہوا کہ اتنی دور اور اتنی دقتوں سے آنے کے بعد بھی اگر اس مجلس کی تمام کارروائی دیکھی اور سنی نہ جا سکی تو یہ تمام محنت اکارت جائے گی۔ چنانچہ میں ہمت باندھ کر اندر کی طرف لپک گیا مگر ع

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے جا کمند — دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

شومئ قسمت ملاحظہ ہو کہ جب در کے اندر گھس چکا تو دربان کی نظر مجھ پر پڑی، وہ عقاب کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں در کے برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے بزرگ کے قدموں پر گر پڑا اور بڑی لجاجت سے عرض کی حضرت! اپنے قدموں کا صدقہ! مجھے اس موذی سے نجات دلائیے۔ انہیں کچھ میری صورت پر رحم آگیا۔ دربان سے بولے "رہنے دو" دربان خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا اور مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ میں وہیں دری پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ میری یہ خاکساری اور نیازمندی انہیں بہت پسند آئی۔ دربان کو ایک سٹول لانے کو کہا۔ دربان کے لئے ان کا یہ حکم ناسور پر نمک پاشی سے کسی طرح کم نہ تھا۔ بولا "یہاں اجازت . . . . . . وہ فرمانے لگے معلوم ہے۔ جو کہا گیا ہے اس کی تعمیل تم پر واجب ہے" چند ہی لمحات کے بعد ایک چھوٹا سا سٹول آگیا۔ اور انہوں نے بہزار شفقت مجھے زمین پر سے اٹھا کر اس پر بٹھا دیا۔ میں اس کمال خوش نصیبی پر نازاں ہی کر رہا تھا کہ یکایک ہاتف نے آواز دی "با ادب! باتمیز! فیلسوف عرب تشریف لا رہے ہیں"

بارہ دری کے صدر در سے مسند تک بیچ میں ایک راستہ رکھا گیا اور وہاں کرسیاں تھیں۔ ہم سب پیچھے دیکھنے لگے۔ دیکھا کہ ایک مرد سن رسیدہ عربی لباس میں۔ بڑے وقار و متانت سے چلا آرہا ہے فلسفہ کی کتابیں ان کے حافظہ میں، فلسفہ کی کہانیاں ان کے دماغ میں اور فلسفہ کے قوانین ان کے دل میں بسے ہوئے تھے۔ خاندان بنو العباس کے کئی اولوالعزم شاہنشاہ ان کے جلو میں تھے۔ چلتے تھے تو اس انداز سے کہ ارض و سما ساتھ ساتھ چلتے تھے رکتے تھے تو اس طور سے کہ زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتے کرتے رک جاتی تھی۔ یہ آکر ایک روپہلی کرسی پر بیٹھ گئے۔

میں نے "خضر طریقت" سے چپکے سے پوچھا "کون بزرگ ہیں"؟ فرمایا "الکندی[1]"

ارا کین پر ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کہ پھر ہاتف کی آواز آئی۔ "با ادب! باتمیز! ماہر حکمت، فاضل طب استاد یورپ تشریف لا رہے ہیں"

اتنے میں ایک نوعمر خوبرو جوان داخل ہوئے۔ کشادہ پیشانی غیر معمولی ذہانت کا پتہ دے رہی تھی۔ لباس نصف عربی اور نصف ایرانی تھا۔ ان کے ساتھ فلسفیوں اور حکیموں

---

[1] سنہ ۸۵۰ء میں وفات پائی۔

کی ایک بڑی جماعت تھی۔ ایران کی خود مختار حکومتوں کے فرمانروا ہمرکاب تھے کمر سے اصطرلاب بندھا ہوا تھا۔ ایک بغل میں شفا[1] اور دوسری میں قانون[2] تھی۔ گاہ نبض دیکھتے۔ گاہ ستاروں سے حساب لگاتے چل رہے تھے۔ آتے اور بڑی تمکنت سے آتے۔ میٹھے اور بڑے وقار سے بیٹھے میں نے اپنے محسن سے پوچھا "کون ہیں" بولے :- "امام الاطبا بو علی سینا[3]"۔

ابھی انہیں چند ہی دقیقے گذرے ہوں گے کہ پر جلال و پر ہیبت مرد غازی داخل ہوا تلوار سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے ماتھے پر خوشبختی اور فتح و کامرانی کے آثار نمایاں تھے۔ آنکھوں کے تجسس سے معلوم ہو رہا تھا کہ کسی کی تلاش میں ہے۔ ابن سینا نگاہ پڑتے ہی لپک کر آیا اور آکر کہنے لگا۔ آخر میں نے آپ کو پا ہی لیا نا"

میں نے پوچھا۔ کون ہیں؟" ارشاد ہوا" محمود غزنوی .... فاتح اعظم۔

ہاتف نے آواز دی" با ادب! با تمیز۔ ریاضی کے فاضل علم نجوم میں کامل اور جواہرات کو پرکھنے کے استاد تشریف لا رہے ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ بارہ دری میں داخل ہوئے ماموں خاندان کے شاہزادے ان کے جلو میں تھے۔ کمر سے اُصطرلاب اور زاویے ناپنے کے آلے بندھے ہوئے تھے۔ ایک بغل میں کتاب[4] الہند اور دوسری میں آثار الباقیہ تھی۔ ان کے علاوہ ہاتھوں میں چند اور کتابیں بھی تھیں محمود غزنوی کے بیٹے اور پوتے ان کے ہمرکاب تھے۔ کیونکہ انہیں غزنانی نام انہیں بزرگ کی بدولت حاصل ہوا تھا۔ جب سواری باد بہاری قریب آگئی تو محمود بھی استقبال کے لئے اٹھ کر چند قدم آگے آگئے۔ انہیں بھی ایک روپہلی کرسی پر جگہ دی گئی۔

میں نے پوچھا" کون صاحب ہیں؟ بولے" البوریحان[5] البیرونی، دنیائے اسلام کا سب سے بڑا ریاضی دان"

ہاتف نے صدا دی با ادب! با تمیز! شاعر، فلسفی منجم و ریاضی دان تشریف لا رہے ہیں"

بزرگ تشریف لائے اور اس انداز سے کہ ایک ہاتھ میں جام مئے سرخ اور دوسرے میں قلم تھی۔ خاندان سلجوق کا شاہ اعظم ملک شاہ[6] ان کے جلو میں تھا۔ ایک گھونٹ پی لیتے

---

۱ ۲ ۳ تصنیفات ابن سینا۔ ۵۳ ۱۰۳۷ ع میں وفات پائی۔ ۵۴ ۱۰۳۰ ع میں وفات پائی ۵۵ ۱۰۴۸ ع میں وفات پائی۔ ۵۶ ۱۰۹۲ ع میں وفات پائی۔

تھے۔ اور ایک سطر لکھ لیتے تھے۔ ان کی بغل میں "جلالی کیلنڈر" تھا دراز قد اور گندمی رنگ تھا۔ داڑھی رکھی ہوئی مونچھیں کتری ہوئی تھیں ایک مرتبہ جو جام منہ تک بیجانے لگے تو یکایک ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا غصہ سے منہ لال ہوگیا اُسی دقت فی البدیہہ کہا ؎

ابریق مئے مرا شکستی ربی! بر من درِ عیش را ببستی ربی
بر خاک فگون نتادہ جام مئے سرخ خاکم بدھن مگر مستی ربی

خالق اکبر کو ان کا یہ کبر سخت ناگوار گزرا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کا منہ سیاہ ہوگیا۔ اب انہیں اپنی گستاخی کا احساس ہوا۔ فوراً دوسری رباعی دربارِ الٰہی میں عرض کی۔ ؎

ناکردہ گناہ درجہاں کیست بگو؟ وانکس کہ گنہ نہ کرد چوں زلیست بگو؟
من بد کنم و تو بد مکافات دہی پس فرق میانِ من و تو چیست بگو؟

ان کا یہ عجز و نیاز اور انکساری و استغفار خدا کو ایسا پسند آیا کہ آن کی آن میں انکا منہ درست ہوگیا اور یہ خاموشی سے ایک رو پہلی کرسی پر بیٹھ گئے۔

میں نے پوچھا "ان کی تعریف؟" فرمایا "عمر خیام[۱]... شاعر تند و شوخ"

ہاتف نے آواز دی "با ادب! با تمیز! شعرائے تصوف تشریف لا رہے ہیں"

پانچ حضرات اندر آئے ایک صاحب عربی جامے میں تھے باقی سب کے لباس ایرانی وضع قطع کے تھے۔ شعر پڑھتے۔ رباعیاں کہتے یہ لوگ چل رہے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کے ہاتھ میں دیوان اور دوسرے میں حدیقۃ الحقیقت کے علاوہ ۶ مثنویاں تھیں۔ دوسرے صاحب کے ہاتھ میں "تذکرۃ الاولیا" اور منطق الطیر تھی۔ تیسرے صاحب غزلوں کا دیوان اور مثنوی لئے ہوئے تھے چوتھے صاحب کی بغل میں ہفت اورنگ، نفحات الانس، شواہد نبوت لوائح جامی اور سلسلۃ الذہب تھی۔ اور پانچویں صاحب اپنا دیوان دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھے۔

میں نے پوچھا "یہ حضرات کون ہیں؟" ارشاد ہوا "سنائی[۲]، عطار[۳]، رومی[۴]، جامی[۵] اور عمر[۶] ہیں"

---

[۱] ۱۱۰۴ع میں وفات پائی۔ [۲] ۱۱۴۴ — ۱۱۴۹ء میں وفات پائی۔ [۳] ۱۲۲۱ع میں وفات پائی۔
[۴] ۱۲۷۳ع میں وفات پائی [۵] ۱۴۹۲ع میں وفات پائی [۶] ۱۲۳۵ع میں وفات پائی۔

ہاتف نے آواز دی "بادب باتمیز! مجاہد اعظم، صوفی و فلسفی۔ امام وقت تشریف لا رہے ہیں۔"

ایک بزرگ تشریف لائے۔ کیمیائے سعادت[1] ایک بغل اور تہافتہ الفلاسفہ دوسری میں تھی۔ ہاتھوں میں منقذ من الضلال کے علاوہ چند اور کتابیں بھی تھیں۔ لباس سے کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ آیا عرب ہیں یا ایرانی فلسفہ کی باتیں سناتے ہوئے آئے، سلوک و طریقت کے محاسن بیان کرتے ہوئے، یہ وہ فاضل تھے جو منطقیوں، دہریوں اور باطنیوں کے اعتراضات کے جواب انہی کے اعتراضات سے دے رہے تھے۔ ان کے جلو میں ایک اور رئیس اور ان کی اولاد تھی۔

میں نے پوچھا کون ہیں؟ فرمایا الغزالیؒ۔ ۔ ۔ ۔ اسلام کے محسن، انہوں نے دین کی اس وقت امداد کی جبکہ فضا صدہا تاویلات کے کارن سخت مکدر ہو گئی تھی۔ اور ان کے پیچھے جو رئیس ہیں وہ نظام الملک وزیر آل سلجوق ہیں۔ نظامیہ کالج (بغداد و نیشاپور) انہی کا رہین منت ہے۔ اور انہوں نے ہی غزالیؒ کو بغداد دینے کے لئے بلایا تھا۔ نظام الملک کی اولاد بھی غزالیؒ سے بڑی عقیدتمندی سے پیش آتی رہی۔"

اب اس بارہ دری میں تمام نشستیں رک چکی تھیں صرف ایک طلائی مرصع کرسی باقی رہ گئی تھی۔ ہم سب چشم براہ تھے کہ اس برات کا دولہا دیکھئے کب آتا ہے۔ بارے قدرے انتظار کے بعد ندا آئی،

"بادب! باتمیز! اجل مشائخ۔ عظام و اعظم عرفائے لازم احترام، اعلم صوفیائے کبار و افضل شعرائے نامدار، غواص دریائے مواج ہزوری و شناور بحر متلاطم سخنوری، جلوہ افروز ہو کر فضائے عالم کو منور فرمانے والے ہیں۔"

ہر ذی روح کی آنکھ صدر در کی طرف لگی ہوئی تھی۔ بالآخر وہ تشریف لائے متوسط قد۔ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، دوربین و تیز فہم آنکھیں۔ گھن دار ابرو والے ایک بزرگ تشریف لائے۔ تمام مجمع اہلاً و سہلاً مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھا۔ مرد خدا پرست کسیا تھ یتیم و بیوہ کی آہیں تھیں، محکوم و غلام قوموں کی سسکیاں تھیں۔ ملتِ

---

[1] تصنیفاتِ غزالی۔ ۵۰۵ھ ۱۱۱۱ع میں وفات پائی۔

بیضا کا فلسفہ، محمدؐ کی محبت اور قوم کا درد تھا۔ سیاستِ عالم، شاعرانہ تخیل و ترنم ان کے ہمرکاب، شیلے کی نظر۔ گیٹے کا تجسس، میر کا بیان سودا کا انداز، مومن کا خیال۔ حالی کی تعلیم، غالب کا فکر۔ بیدل کی طرز اور داغ کی نازک خیالی ان کے جلو میں تھی۔

میں نے پوچھا "کون بزرگ ہیں؟ بولے "اقبالؒ"

میں نے عرض کی "کہاں کے رہنے والے ہیں؟" ارشاد ہوا انہیں کی زبانی سن لو وہ یہ فرماتے ہیں ؎

پر سوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خرسند

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

میں نے کہا "بہت بڑے شاعر ہیں مگر شاعری کس قسم کی کرتے ہیں؟ فرمایا "اپنی شاعری کے متعلق یہ کہا ہے ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ میخانہ

اور اس کو یوں کہا ہے ؎

نہ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال فقیر راہ نشیں است و دل غنی دارد

میں نے پوچھا کیا اسلاف کا بھی ذکر خیر کرتے ہیں"؟ "ہاں" انہوں نے فرمایا اس کے متعلق بھی سنو۔ ڈاکٹر صاحب ہسپانیہ کے مسلمانوں کے متعلق یوں فرماتے ہیں ؎

پوشیدہ تیری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں خاموش اذانیں ہیں تیری بادِ سحر میں

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سنا بھی ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

اقبال انسان کو اسباب کی ترغیب دلاتے ہیں کہ ایک بلند مقصد حاصل کرنے کے لئے اسے بلند مقصد کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ سکون خواہ وہ جنت ہی کا سکون کیوں نہ ہو اس کے لئے موت کا پیغام ہے۔ خودی کی منازل ترقی اس عالم کون و مکاں سے بھی بہت آگے ہیں ؎

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

؎ ۱۹۳۷ء میں وفات پائی۔

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا　　　کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

احیائے خودی اقبال کا سب سے بڑا اور اہم پیغام ہے - چنانچہ فرماتے ہیں ؎

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد　　　ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ تیرے سنگِ راہ سے پھوٹے　　　خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

سوال اور گدائی کا نظریہ یہ ہے ؎

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

مسئلہ فقر ملاحظہ ہو۔

ایک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری　　　ایک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری

خالق و مخلوق کے تعلقات کو اس طرح نبھاتے ہیں ؎

گدائے جلوہ رفتی بر سر طور　　　کہ جانِ تو ز خود نا محرمی است
قدم در جستجوئے آدمی زن　　　خدا ہم در تلاش آدمی است

غرضیکہ انہوں نے زندگی کے مختلف اہم شعبوں پر نرالے انداز سے روشنی ڈالی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ تمام بصیرت افروز تقریر سننے کے بعد میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں اپنے محسن کے متعلق بھی تو کچھ جان لوں! چنانچہ میں نے اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے بصد ادب عرض کیا "بندہ حضور کا اسم گرامی دریافت کرنے کی جرات کر سکتا ہے؟" وہ مسکرا کر فرمانے لگے ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے　　　کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

یکایک میری آنکھ کھل گئی - دیکھا کہ شمع رو رو کر اپنے آپکو مٹا چکی ہے اور اب کوئی دم کی مہمان ہے - یہ لیجئے ہوا کے سرد جھونکے نے اسے فنا کا راگ سنا دیا . . . . وہ بجھ گئی ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　　ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی بجھی ہوئی

محمد ساجد بی - اے (آنرز) ایم - اے - اولڈ بوائے

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت
شریک سوز و ساز بحر و بر شو
تو این جنگ از کنار عرصہ بینی
بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

[illegible]
[illegible]
بدریا غلط و با موجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است
(اقبال)

حیات افروز پیغام اقبال

(مسلمانوں کے نام)

از سہ قرن ایں امتِ خوار و زبوں　　زندہ بے سوز و سرورِ اندروں
پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق　　مکتب و ملائے او محروم شوق
از شتیِ اندیشہ او را خوار کرد　　افتراق او را از خود بیزار کرد
تاند انداز مقام و منزلش　　مرد ذوقِ انقلاب اندر دلش
بندہ رد کردہ مولا است او　　مفلس و تلاش و بے پرواست او
نے بکف طلے کہ سلطانے برد　　نہ بہ دل نورے کہ شیطانے برد
آں از آں قومے کہ چشم از خویش بست
دل بغیر اللہ داد از خود گسست

اقبال (خدا اُسے کروڑ کروڑ جنت نصیب کرے) اپنی قیدِ حیات میں مسلمانوں کی اغیار کے ہاتھوں تباہی، بے بسی، زبوں حالی اور شکستہ دلی دیکھ کر ہمیشہ کُڑھتے رہتے تھے۔ اور اُن کا دل فرطِ غم والم سے ہر دم وحشت زار بنا رہتا تھا خود فرماتے ہیں۔

مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بُو رہتا ہوں میں　　زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

اسی لئے اُن کی تخلیقی قوتیں ساری عمر مسلمانوں کو ذلت و نکبت کے تیرہ غاروں سے نکال کر دنیا میں ہمدوش کامرانی کرنے میں مصروفِ کار رہیں ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا　　نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ایک وقت تھا کہ مسلمان شرق و غرب کے تاجدار، امن و امان کے علمبردار، اور تہذیب و تمدن کے حاشیہ بردار تھے۔ ان کی تلوار خارا شگاف کی جھنکاروں سے قیصر و کسریٰ کے کاخ و ایوان لرز اٹھتے تھے۔ کوہ و دشت کی رکاوٹیں ان کے کوہِ وقارِ عزم و استقلال کے سامنے ہرِ کاہ سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھیں۔ طوفانی سمندروں کی امواج اور بحر آسا دریاؤں کی سیلاب کاریاں ان کے سمندِ تیز گام کی گذر گاہوں کا سدِباب کرنے سے یکسر قاصر تھیں۔ میدانِ کارزار میں اعداء بدنہاد کے ٹڈی دل لشکر چند لمحوں میں پراگندہ

ہو جاتے تھے۔ اور ہند و چین کے سرسبز و شاداب میدانوں سے لے کر ہسپانیہ کی سنگلاخ سرزمینوں تک پرچم اسلام لہراتا تھا۔ ؎

جدھر رخ کیا سلطنت زیر فرماں | جدھر آنکھ اٹھائی ممالک مسخر،
لڑائی میں ایک ایک دس دس پہ بھاری | شہیدان بدر و شجاعان خیبر
لگیں دشمنوں کے تیں ہو کے چھرے | اگر پھینک دیں لے کے مٹھی میں کنکر
بھگا دیتے اعداء کو یوں غازیوں نے | اڑا کر ہوا جیسے لے جائے مچھر
خدا اور رسولِ خدا ان کے حامی | کوئی آسکے ان سے کس طرح بر سر

یہ سب محض قوت ایمانی اور ذوقِ عمل قرآنی کا کرشمہ تھا۔ جیسا کہ خود اقبال نے یوں گوہر افشانی کی ہے ؎

کچھ تو بتلاؤ کہ تھا کو نسا وہ فطرت کا راز | جس سے اعراب جہاں میں ہوئے کسب مختار
باغِ عالم میں وہ تھے صورتِ مرغ بے پر | کس سے اڑنے سے اڑائے یہ نرالے انداز
اڑ کے اس عالم منصلی سے فلک بوس ہوئے | تہ شکستوں کو کس نے دیا ذوق پرواز
سچ تو یہ ہے کہ تیرا ناز ہی قرآن پہ ہے | اور ترقی کا تری راز ہی قرآن پہ ہے

دورِ ماضی میں مسلمانوں کی سروری اور سربلندی کا سبب قرآن مجید کی انقلاب آفریں تعلیم و ہدایت تھی۔ جو ارتقاء حریت کا سنگِ اساس ثابت ہوئی ؎

اسی کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم | بن گئی دہر میں جا کر چمن آرائے بہار
یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن | فاش کرنے لگے جبرائیل امین کے اسرار
یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عرب کے بچے | کھیلنے جاتے تھے ایوان گہ کسریٰ میں شکار

گذشتہ تین چار صدیوں سے مسلمان تعلیم الہی سے جتنا دور ہوتے جاتے ہیں اتنے ہی روز بروز رسوائے عالم ہوتے جاتے ہیں، ان کے گلے میں غلامی کے طوق پڑ رہے ہیں۔ سیاست و جہانبانی کا دیوالہ نکل گیا ہے۔ تلخ صداقت سے لبریز ہماری اس حالت زار کا کیا صحیح نقشہ اقبال نے کھینچا ہے ؎

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق | مومن و غداری و مکر و نفاق،
با پشیزے دین و ملت را فروخت | ہم متاع خانہ و ہم خانہ سوخت
لاالہ اندر نمازش بود و نیست | ناز ہا اندر نیازش بود و نیست

نور در صوم و صلواۃِ او نماند　　جلوۂ در کائناتِ او نمود،
آنکہ بُود اللہ او را ساز و برگ　　فتنۂ او حبِ مال و ترسِ مرگ
رفت ازآں مستی و ذوق و سرود
دیں او اندر کتاب و او بگور

قرآنی تعلیم سے رو گردانی کرنے کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ دنیا کو پیام بیداری و سرشاری دینے والی یہ اولوالعزم قوم آج خود کچھ اس قیامت کی نیند سو گئی ہے کہ یہ دورِ ابتلا بھی اسے ہوشیار نہیں کر سکا۔ اور نتیجتاً اس کے اسلاف کی بیتی ہوئی رنگین سرگذشتیں بھی رسوائے چار دانگِ عالم ہوتی جاتی ہیں ؎

ہم وہ ہیں کہ او ندھے پڑے ہیں قعرِ ذلت میں　　فضیلت ایک بھی اسلاف کی ہم میں نہیں باقی
یہ جینا کیسا جینا ہے یہ ذلت کیسی ذلت ہے　　نہ دُنیا کا شرف باقی نہ رسم و راہِ دیں باقی
ہمارے جسم پژمردہ دماغ افسردہ دل مردہ　　غمِ ایام سہنے کو یہاں ہیں اب ہمیں باقی

اقبال کی چشمِ دوربین میں مسلمانوں کی موجودہ پستی اور ہمہ گیر زوال کی ایک گراں بار وجہ قرآنی تعلیمات سے منہ موڑ کر مغرب کی اندھا دھند تقلید ہے حالانکہ ان کے نزدیک ؎

تقلید کی روش سے بہتر ہے خودکشی　　رستہ بھی ڈھونڈھ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

مغرب کی نام نہاد آزادی جو دوسری قوموں کے گلے میں طوقِ غلامی بن کر ملمع کا ہار بن جاتی ہے۔ ایک سراب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ؎

تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مئے مغرب اثر　　خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن مدہوش ہے

ایک دوسری جگہ تہذیب جدید کے پرستار نے مسلمانوں کو یوں تنبیہ کی ہے ؎

تجھے معلوم ہے غافل کہ تیری زندگی کیا ہے　　کنشتی ساز معمورِ نواہائے کلیسائی،
ہوئی ہے تربیت آغوشِ بیت اللہ میں تیری　　دلِ شوریدہ ہے لیکن صنم خانے کا سودائی

تہذیبِ حاضرہ کی قاطع ظلمت خاصیت سے جس کا مآل ضعفِ بصیرت ہے اقبال سراپا بیزار ہے۔ اور اپنی قوم کی کج فہمی پر نالاں ہے ؎

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں　　بھڑک اُٹھا ہے بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی
حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا　　رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی
فروغِ شمع نو سے بزمِ مسلم جگمگا اُٹھی　　مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی

تو اے پروانہ ایں گرمی ز شمع محفلے داری		چو من در آتش خود سوز اگر سوز دلے داری

مسلمان از منہ گذشتہ میں تہذیب و تمدن کے بانی مبانی تھے۔ انہیں کسی اور قوم کے طرز تمدن و آئین جہانگیری کی گلچینی کی اصلاً حاجت نہیں ہے ان کے پاس ایک ناقابل تغیر و تبدل نظام ربانی موجود ہے۔ جو اقبال کے چشم بصیرت میں مسلمانوں کو زندگی کے حقائق سے دو چار کرنے کی بدرجہ اتم اہلیت رکھتا ہے ؎

مرگ را سامان ز قطع آرزو است		زندگانی محکم از لَا تَقْنَطُوا است

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر		از نبیؐ تعلیم لَا تَحْزَنْ بگیر

قوتِ ایمان حیات افزایدت
ورد لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ بایدت

قرآنِ کریم کو حرزِ جان بنانے کا نتیجہ دنیاوی زندگی کی کامرانیاں اور اخروی زندگی کی فلاح ہے ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن		نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اقبال رسولِ کریمؐ کے اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھ کر مسلمانوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی پر زور ہدایت کرتا ہے۔ اور قرآنی تعلیمات کی تکمیل کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے عشقِ رسولؐ کو باقی تمام دنیاوی محبتوں پر مقدم رکھتا ہے۔ اور اس کے فقدان کو مسلمانوں کی موجودہ ذلت و نکبت کا جواز ٹھہراتا ہے ؎

شبے پیشِ خدا بگریستم		مسلماناں چرا زارند و خوارند

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم		دلے دارند و محبوبے ندارند

دیکھئے! اقبال نے گنبدِ خضریٰ کے مکین کو کتنے سرور انگیز انداز سے یاد کیا ہے۔ اور ہر ایک مسلم کو اسی طور یاد کرانے کا مشتاق ہے ؎

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است		اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

رسولِ کریمؐ کا سچا عشق، شوقِ جہاد، اور تعلیم قرآن ہی وہ گنتی کی چیزیں ہیں جن کی طفیل مسلمان اپنے آپ کو نعمتِ آزادی، دولتِ جہانبانی، اور توقیرِ زندگانی سے مالا مال کر کے دنیا میں سربلند اور شادکام ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن۔ قرآن پڑھنے والوں کو نئی زندگی اور نئی دنیا عطا کرنے میں بیباک ہے ؎

صد جہاں تازہ در آیات اوست　　عصر ہا پیچیدہ در آیات اوست
بندۂ مومن ز آیات خداست　　ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
مے دہد قرآں جہانِ دیگرش

خلوصِ دل - نیک نیتی سے سرشار مسلمان ہمیشہ ظلم و استبداد پر فتح و نصرت حاصل کرنے میں کامیاب رہیں گے کیونکہ ؎

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے　　وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

مسلمان ایک رفیع المنزلت اور جلیل القدر قوم ہے اور اقبال کے نزدیک آسمانوں کی بلندی اس کے مستقبل کے عروج کے سامنے ہیچ ہے ؎

یہ ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی　　ستارے جسکی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اور اگر اس کے دل میں قوتِ اعتماد ہو اور ذوقِ عمل۔ تو وہ نظام عالم میں دستِ قدرت کا درجہ رکھتا ہے ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اقبال اسلامی روایات کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر مردہ قوم کے دلوں میں جوت جگانے کا متمنی ہے۔ لیکن وہ کوئی خالی خولی باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ حقیقت واقعیت سے مملو ہیں۔ ان میں حیات افروز پیغام دیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ کہ ابدی زندگی کی کامرانیوں کے حصول کیلئے نادر حقائق طشت از بام کئے ہیں ؎

کہاں آباد ہستی میں یقین مردِ مسلماں کا　　بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
ثباتِ زندگی ایماں سے محکم ہے دنیا میں　　کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
ولایت بادشاہی علم اشیا کی جہانگیری　　یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم　　جہادِ زندگانی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

بعض مسلمان جو مالی پریشانیوں سے انفرادی عظمت کے حصول کو ناممکن سمجھتے ہیں اقبال انہیں عملی جد و جہد کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس کے خوشگوار انجام کی توقع کرتا ہے ؎

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر

کہ جہاں میں نانِ شعیر پہ ہے مدارِ قوتِ حیدری

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے ؎

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو ادا مثالِ نماز ہو جا

اقبال خودی کا پورا پورا قائل ہے۔ اس کی چشمِ بصیرت زندگی کے تمام مصائب اور دنیا کی تمام گتھیوں کو اسی سے سلجھانے کی دعویدار ہے۔ اس کا یقین ہے کہ حیات اس کے بغیر کامران و کامگار نہیں ہو سکتی ؎

تمنا آبرو کی ہے اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

اسی نظریہ کو ایک دوسری جگہ یوں نظم کیا ہے ؎

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا — خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
گزر جائیں گے سیلِ تند رو کوہ بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ایک اور جگہ پر اقبال نے خودداری (خودی) کی نہایت واضح انداز میں تصویر کھینچتے ہوئے یوں درسِ ہنگامہ دیا ہے ؎

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا — ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

اقبال ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے کا حامی نہیں۔ وہ "حرکت میں برکت ہے" کا پورا پورا قائل ہے اور اسی میں قوم کی بھلائی سمجھ کر پیغامِ حیات دیتا ہے ؎

نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات — تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر

اس کے علاوہ اپنی قوم کے افراد کو اپنے قدموں کے سہارے پنپتا دیکھنے کا آرزومند ہے دوسروں کا سہارا ڈھونڈھ کر زندہ رہنے والوں کو نگاہِ نفرت سے دیکھتا ہے ؎

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم　　اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

انسان اپنے عمل سے اسی دنیا میں خود ہی جنت بنا لیتا ہے۔ اور خود ہی دوزخ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

قیودِ آئین کی پرواہ کرنے اور نہ کرنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے اقبال کی زبانِ فیض ترجمان سے سنیئے ؎

دہر میں عیشِ دوام آئین کی پابندی سے ہے　　موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

اقبال مسلمانوں کو غفلت کوشی اور بے حسی سے ہوشیار و بیدار کر کے مستقبل کی سہانی فضاؤں میں آزادی کے سانس کیلئے پیکارِ حیات میں نتیجہ خیز غلغلہ سننے کا طلبگار ہے ؎

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

فتح محمد تلوکر
ایف۔ اے سٹوڈنٹ

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

اقبال

حیاتِ ابدی

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

نظامِ عالم میں ہستی و عدم کے زبردست اور اٹل قانونِ قدرت کے عمل کا کس کو انکار ہے دریا میں حباب تیرتے ہیں۔ ہوا میں غبار اٹھتے ہیں۔ مرغِ آشیاں پرست نے ہزاروں تنکوں سے آشیانہ بنایا۔ برق کے ایک خندہ پر نثار کر دیا۔ ابھی بلبل گلِ شگفتہ پہ وجد و مستی کے راگ گاتی تھی۔ ابھی پریشان پتّوں پر حسرت و یاس کے آنسو گراتی ہے۔ اس سے کہیں بہت پہلے غالب مرحوم نے اس صحیح قدرت کو ایک عجیب فلسفہ میں پیش کیا ہے

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولے برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس سے زیادہ آسان اور شاید زیادہ دلچسپ رنگ میں کسی اور صاحبِ ذوق نے قدرت سے بے تکلفی کی ہے

شبیہ مدِ نظر ہے کس کی کہ کوئی پوری نہیں اُترتی
مٹا دیئے صانعِ ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

لیکن اگر اس قانونِ قدرت کا ذرا سر جھکا کر مطالعہ کریں۔ تو قدرت نے کہیں کہیں دیکھنے والوں کی نظروں پر تھوڑا سا پردہ ڈال کر استثنٰے بھی برتا ہے۔ اور وہ اس طرح:-

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں اور روحانی سلاطین کو میں نہیں لے رہا۔ اُن سے دوسرے درجے پر ایک گروہ بھی ہے۔ جو ہمیشہ نہیں کبھی کبھی خدا کی سرزمین پر آباد ہوا اور یہ وہ خدا کے بندے ہیں۔ جو مٹ کر بھی نظر بینا کو حیاتِ دائمی میں نظر آتے ہیں لیکن جیسا کہ اوپر کنایۃً بیان کیا گیا ہے۔ اُن کی حیاتِ ابدی کی تعمیر عشق کی تاب و تب

اور عالم سوز و ساز میں ہوا کرتی ہے۔ اور پھر وہ اُس چراغ کا حکم رکھتے ہیں جس کے لئے سحر نہیں۔ اُس انجم کی مثال ہیں۔ جس کے لئے مہر نہیں۔ اس سورج کی مانند ہیں۔ جس کو زوال نہیں۔ صدیوں کے بعد اسلامی دنیا میں اقبال کو قدرت نے وہ جنم دیا کہ ہم کھلے بندوں اس کے نام کو اُن پاک بندوں کی فہرست میں اندراج کرتے ہیں۔ جن کا کہ ذکر ہو چکا ہے یوں تو ہزاروں مسلمان بادل کی طرح نمودار ہوئے۔ رعد کی طرح گرجے اور اپنے پیغام کو برق سے ملمع کیا۔ لیکن وہ نالہ جو حقیقی درد و سوز کا ترجمان ہے مصلح ملت اور محسنِ مسلم علامہ اقبال سے نکلا ہے ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

سچ ہے کہ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اقبال کا زورِ بیاں کیا کہوں طرزِ ادا سبحان اللہ۔ پروازِ خیالات اللہ اللہ۔

؎ بلائے جان ہے غالبؔ اُس کی ہر بات عبارت کیا اشارت کیا ...... ادا کیا

اُن کی ساری داستان چھان مارئیے۔ ایک ایک لفظ میں پس ماندہ و پس افتادہ قوم کے سنبھلنے کا پروگرام پاؤ گے۔ بلکہ اگر چشمِ مصلح سے دیکھا جائے تو ایک ایک جملے میں پیر عرب کی صدا مضمر ہے۔

؎ از سر تا بہ قدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا اینجا است

ہاں ہاں دنیا ایک ایسے مفکرِ اعظم اور مجددِ ملت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی جو اس کے لئے آخری رمقوں میں مسیحائی حکم رکھتا ہے۔ نہ ہی قدرت ایک ایسے مومن کو حیاتِ ابدی بخشنے میں بخیل ہو سکتی ہے۔ جو اس قدر شوق و جذبے سے اس کے نام لیواؤں کو اُبھارتا ہے ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اپنے مقاصد کی بلندی اور اُدھر قوم کی انتہائی کوتاہی پیش نظر آتی ہے تو کس جوش سے مومن کو اس کی حقیقت سے آشنا کرتے ہیں۔ ؎

کوئی کر سکتا ہے کیا اندازہ اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اللہ اللہ مسلمان کا زورِ بازو کیا رنگ لائیگا - جب اُس کی ایک نگاہ لوحِ محفوظ پر اپنے اشاروں سے لکھوا بھی سکتی ہے - اور مٹوا بھی - اس پر بھی اگر اپنے پیغام کو صدا بصحرا پاتا ہے تو کتنے عجیب اور نرالی طرز میں قوم کو غیرت اور خودداری کا پیغام پہنچاتا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

وقت کوتاہ اور قصہ طولانی اُن کا یہ دعوے ہرگز باطل نہیں ہوسکتا کہ

؎ جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

اگرچہ مصداق ؎ حدیثِ دردِ دل آویز داستانے ہست
کہ لطفِ بیش دہد چوں دراز تر گردد

محبت و ارادت کا تقاضا ہے کہ یہ داستان چلتی رہے - لیکن اعتدال کا اصول مدنظر ہے - اور اسی پر اکتفا کرتا ہوں ؏

خدا رحمت کند عاشقانِ پاک طینت را

(قادر بخش المعروف مرید باغی ......)

ستارہ کا پیغام
مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

رباعی
ترا تن روح سے ناآشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

اشعار

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے

مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

(اقبالؒ)

گلہائے عقیدت

(فخرِ ملتِ اسلامیہ علامہ اقبال رح)

رحمتِ الٰہی کی ایک وہ شعاع رنگ و نور جو پیکرِ انسانی میں جلوہ گر ہوکر اس تیرۂ خاکدان کو رشکِ صد کہکشاں بنانے آئی تھی اور بنا گئی۔

وُہ آفتاب رُشد و ہدایت جس کی ضُوافشانیوں اور نور باریوں نے گم گشتۂ بادیۂ ضلالت کاروان کو اپنی خلقی آزادی و عظمت کے انتہائی کنگروں پر پہنچنے کے اہل بنا دیا۔

وُہ بلند پرواز شاعر جس کے دل کی تخلیقی قوتوں کے سحر پرور نغموں کے کیف ریز ترنم نے انس و جن کی رباب روح کے سب سار تاروں کو مرتعش کر کے صبح منتظر کے حسین خوابوں کی حیات افروز تعبیر دیکھنے کے قابل بنا دیا۔

وُہ نکتہ رس اور باریک بین فلسفی جس کا تنِ خاکی فرشِ زمین پر رہا لیکن اس کی دُور رس نگاہ ہمیشہ استعجاب انگیز فلک پیمایوں میں محوِ تماشائے فطرت رہی!

وُہ سحر نگار ادیب جس کے گلریز اور عنبر فشار قلم کی بوقلموں گردشوں نے لاغرتن قوم کے افسردہ جذبات و احساسات میں ہمہ گیر شعلۂ محشر خیزی کی درخشانیاں اور تابانیاں پیدا کر دیں۔

وہ آتش بیاں خطیب جس نے اپنی سحر پاش تقاریر اور جادو بیان گفتار سے کفر و ظلمت کی دھجیاں اڑا دیں۔ اور حق و صداقت کو آشکارا کر کے اُفقِ مشرق سے شفقِ سحر کی سُرخی پھوٹنے کی بشارت دی!

وہ معمارِ حیاتِ مشرق جس نے طوفانی زلازلِ مغرب کی پیہم زہرہ گداز تباہ کاریوں کے باوجود اپنی چابکدستی اور طلسم کار نقاشی سے قصرِ آزادیٔ ہند کی متزلزل بنیادوں کو کوہ وقار بنا کر مشرقی تہذیب و تمدن کے طیلسان کو ریزہ ریزہ ہوجانے سے بچا لیا!

وہ واقفِ اسرارِ سیاست قائد جس نے اعداء بدنہاد کے پیدا کردہ خار زاروں کو اپنے عزم شعلہ بداماں سے جلا کر خاکستر سیاہ کر دیا۔ اور اپنے کوہ شکن عزم کی مسیحا نفسی سے اُسی خاکستر سیاہ سے اپنی درماندہ قوم کے لئے ایک چمن لالہ زار پیدا کر دیا۔

وُہ فرزندِ اسلام جو شمعِ رسالت کا پروانہ اور مئے وحدت کا مستانہ ہونے کی بنا پر مذہب و ملت کے داعیوں کو از سرِ نو اسیریٔ قرآن کی لذت سے آشنا کیا یہ قید و بند جوفِ صدف میں اک قطرۂ ابرِ نیساں کو گوہرِ آبدار اور نافۂ آہو میں اک قطرۂ لہو کو مشکِ اذخر بنا دیتی ہے۔

وُہ باکمال انسان جس نے اپنی معجزہ کار شخصیت کے معجزوں سے دنیا کے سحرِ سامری کو دور کرکے اطراف و اکنافِ عالم کو سراپا تمکینِ وادیٔ ایمن بنا دیا!

وُہ ہمدردِ بنی نوعِ انسان جس نے اپنی صراطِ مستقیم پر شبِ دیجور کی تاریکیوں کو اپنے جہاں برہم زن استقامت کی نورانی تجلیوں سے جلوۂ انوارِ سحرِ درخشاں میں بدل دیا۔

فتح محمدؐ تلوکر
متعلم الیف۔ اے

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے
تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بت کدے میں کھو گیا کون

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں!
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے!

رباعیات

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

(اقبالؒ)

موت ——— اقبالؒ کی نظر میں

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست (اقبالؒ)

زندگی اور موت دنیا کے دو اصول مسلمہ ہیں۔ دنیا کا دار و مدار صرف ان دو ہی قانونوں پر قائم ہے۔ زمانہ کے انقلابات۔ دُنیا کے تغیرات۔ اور کائنات کی رنگین داستان کیا ہے؟

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے (اقبالؒ)

دنیا میں پیدا ہوئے۔ جئے اور پھر مر گئے۔ گویا موت ایک اٹل چیز ہے جس کا سامنا لازمی اور یقینی ہے۔ موت کسی خاص ترتیب کی محتاج نہیں۔ نا کہ بتدریج انسان اس کے شکار ہوں۔ کیونکہ نہ ہی سِن رسیدہ لوگ اس کی صفِ اوّل میں ہیں اور نہ متمول اور دولتمند لوگ نہ اسے عمر رسیدہ بزرگوں کا کچھ لحاظ ہے اور نہ گنہگاروں سے دشمنی و عداوت۔

اگرچہ موت بظاہر ایک مہیب اور ڈراؤنا بھوت ہے۔ لیکن حقیقت میں موت ابدی اور غیر فانی زندگی میں داخل ہونے کا ایک راستہ ہے جسے طے کرنے سے خود موت کی ہستی مٹ کر رہ جاتی ہے۔ اسی لئے اسلام نے مسلمانوں کو دلیری اور خندہ پیشانی سے موت کو لبیک کہنے کی تعلیم دی۔ اور یہی وجہ تھی کہ بزرگانِ سلف نے موت کو ایک بچوں کا کھیل تصور کیا۔ موت کی دہشت۔ خوف اور ڈر سے مسلمانوں کے دل نہ دہل سکے۔ اور انہوں نے موت کے تلخ جام کو ہنستے ہوئے نوش کیا۔

موجودہ دَور میں موت نامعلوم کب اور کس دن نازل ہو۔ لیکن فکرِ موت اور اس کے خوف و ہراس سے ابھی سے پانی میں مٹھاس کی مانند گھلنے کے علاوہ کام ہی نہیں۔ معمولی حرارت ہونے پر موت کا نقشہ بندھ جاتا ہے۔ دل کمزور۔ حالت ابتر۔ حواس باختہ اور بدن میں لرزہ شروع۔ جیسا کہ ہم نے شاید کبھی بھی منزلِ موت طے ہی نہیں کرنی۔ غرضیکہ "قبل از وقت ویدۂ مرگ" کا مجسمہ بن کر رہ جاتے ہیں یہ ہے ہماری بہادری۔ شجاعت۔ دلیری۔ ہمارا ایمان اور مسلمانی۔ ہماری ضعیف الاعتقادی نے ہمیں اس قدر ڈرپوک اور بزدل بنا دیا ہے کہ ہم موت

سے ایسے ڈرتے ہیں جیسے غلیل سے کوّا۔ اور موت کا نام سنتے ہی ہماری رگوں میں خون خشک ہو جاتا ہے۔ اکثر ہماری یہی جد و جہد رہتی ہے۔ کہ کسی ایسے خطہ میں دور چل کر بسیں جو موت کی بندشوں سے آزاد ہو۔ اور ملک الموت کی پہنچ سے بھی کہیں دُور۔ لیکن یہ خام خیالی محض ہمارے خیالات تک ہی محدود رہ جاتی ہے۔ ہم کیا بلکہ ایسے حکمرانوں نے جن کا مشرق سے مغرب تک ڈنکا بجا۔ مرتے وقت بزدلی کا ثبوت دیا۔ وہ بہادر جنگجو جنہوں نے میدانِ جنگ میں ہزاروں بہادروں کے سر قلم کئے۔ مرتے وقت ڈرپوک ثابت ہوئے۔ اور لرزتے کانپتے جان جانِ آفریں کے حوالے کی۔

افسوس آج سے کئی سو برس پہلے جو ہمارے بزرگوں نے ہمیں موت سے نڈر رہنے کی تعلیم دی تھی۔ ہماری کوتاہ نظری اور ایمانی کمزوری کا نشانہ بن کر رہ گئی۔ اسی لئے تو اقبال رحمہ مرحوم فرماتے ہیں " مَیں تو حیران ہوں لوگ موت سے کیوں ڈرتے ہیں؟ حالانکہ یہ بھی زندگی (حیاتِ انسانی) کا ایک پہلو ہے" یہی وجہ ہے کہ اقبال رحمہ جیسے کامل انسانوں نے جن کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن تھی۔ جو حقیقی معنوں میں مسلمان کہلوانے کے حقدار تھے۔ موت سے بے خوف رہے۔ واقعی ؎

پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت
لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے		(اقبال رحمہ)

اقبال رحمہ نے جس خندہ پیشانی۔ مردانگی اور سلامت روی سے موت کا استقبال کیا۔ دنیا پر اظہر من الشمس ہے۔ انہوں نے عملی طور ثابت کر دیا۔ کہ مسلمان موت سے ہرگز ہراساں نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ نے بسترِ مرگ پر لیٹے ہوئے داعیِ اجل کو لبیک کہنے سے چند لمحے پیشتر اپنے دوستوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

" میں مسلمان ہوں۔ اور مسلمان خندہ پیشانی کے ساتھ موت کا استقبال کرتا ہے میں موت سے مطلق ہراساں نہیں ہوں " اور مسکراتے ہوئے جان اپنے جان آفریں کے حوالے کر دی۔

آہ! اقبال کی زندگی اور اس کے فعل و قول میں کس قدر مطابقت تھی۔ کہ آخری وقت میں بھی انہیں اپنی اسلامانہ و مسلمانانہ عظمت و بلندی کا پاس تھا۔ اور موت کے خوف سے کبھی بھی ان کا چہرہ پژمردہ نہ ہوا۔ بلکہ ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست

کی صحیح تفسیر بن کر بہ خوشی دوسری دنیا کو سدھارے۔ کیونکہ اقبال کے نزدیک موت ایک عارضی جدائی ہے۔ جو اس قابل نہیں کہ اس پر آنسو بہائے جائیں۔ یا اُسے ماتم کدہ بنایا جائے۔ مرنے سے مراد صرف آنکھ سے اوجھل ہونا ہے۔ جیسا کہ اکثر اوقات مسافر کسی شاہراہ پر چلتے چلتے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جایا کرتے ہیں نہ کہ فنا ہونا۔ کیونکہ فنا سے مراد ہمیشہ کے لئے نابود ہونے کے ہیں ؎

جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہی　　ازل کے بحر سے پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا　　نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

حق تو یہ ہے۔ کہ علامہ مرحوم نے موت کے پردۂ ناموس کو چاک کر کے ہی رکھ دیا ہے اور دکھا دیا کہ یہ صرف ہماری ضعیف الاعتقادی ہی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم نے موت کو اس قدر مشکل اور خوفناک بنا رکھا ہے۔ ورنہ حقیقت میں یہ صرف عارضی مفارقت ہے۔ دائمی جدائی نہیں۔ نہ یہ بھوت ہے اور نہ دیو ہیکل۔

جب موت کی اصلیت یہ ہو تو پھر کیا ڈر؟ کیسا خوف؟ کیوں نہ خندہ روئی سے ہی مسلمانوں کو اسے لبیک کہنا چاہئے۔ تاکہ ہمارے رہبر (مراد اقبال) نے جو مسلمان کو پرکھنے کی کسوٹی بتائی ہے ہم بھی اس کے مطابق "چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست" ثابت ہوں۔ اور حالتِ نزع میں خود مسکرائیں اور روتوں کو بھی ہنسائیں۔

علی محمد ڈاہر
متعلم بی۔ اے۔

اقبالؒ کی موت پر

یہ مرثیہ شاعرِ مشرق حکیم اُمت حضرت علامہ اقبالؒ کی مرگِ جانکاہ کی خبر سُنکر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو لکھا گیا تھا

کس لئے مغموم ہے دیکھو فضائے آسماں؟ فطرتِ معصوم کیوں ہے چرخ پر ماتم کناں
قدسیوں کی چشم کس کی موت پر نمناک ہے؟ کس کے ماتم میں فرشتوں کا گریباں چاک ہے؟
جا رہا ہے چھوڑ کے کیا کوئی مالیِ گلستاں؟ جس کا ماتم کر رہی ہیں گلستاں کی ڈالیاں
آہ! کیوں ہندوستاں میں شام جلوہ ریز ہے شورزارِ ہند کیوں یکسر سکوت انگیز ہے؟
ہائے! ہم آغوشِ منزل ہو گیا وہ آفتاب موت کی وادی میں جا کر سو گیا وہ آفتاب
جسکی کرنوں سے منور رفعتِ افلاک تھی جسکی تابانی سے رشکِ مہ جبینِ خاک تھی

اُٹھ گیا وہ مردِ عارف جس کا دل تھا الکتاب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

ملتِ مرحوم کا نامی جواں اقبالؒ تھا اور ناموسِ وطن کا پاسبان اقبال تھا
اُس کا سینہ آتشِ احساس سے معمور تھا سرِ مرگ و زیست اُس کے قلب میں مستور تھا
اُس کا پاکیزہ تخیل اُس کے قلبی واردات اہلِ مشرق اہلِ مغرب کے لئے جامِ حیات
اُس کا پاکیزہ تخیل صیقلِ ادراک تھا خواہش و تحریص کے مہلک اثر سے پاک تھا

اُس کے نغمے غیرتِ صد نغمۂ جبریلؑ تھے
زیست کا پیغام تھے یا صورِ اسرافیل تھے

مردِ دانا کس پہ ہم کو چھوڑ کے جاتا ہے تو بات کیا ہے؟ کس لئے منہ موڑ کے جاتا ہے تو
کس طرح طے کر سکیگا اے امیرِ کارواں کارواں تجھ بن بیاباں دیکھنا یہ بیکراں
طے کریگا کاروانِ جذب و مستی کس طرح ناخدا تیرے سوا یہ بحرِ ہستی کس طرح
کاش کچھ دیر اور رہ جاتا یہاں تیرا وجود تا کہ بتلاتا ہمیں تو کیا ہے سرِ ہست و بود
اور سمجھاتا ہمیں کیا چیز ہے ذوقِ نمود کس طرح سے ہوتی ہے انساں کے دل کی کشود
کاش تو ہم کو بتاتا سرِ موسےٰ و خلیل کاش تو ہم کو بتاتا کیا ہے سرِ رودِ نیل
کاش تو ہم کو بتاتا کیا ہوا ایمن کا نور کیا سبب ہے اب نہیں انساں کو حاصل حضور

گیسوئے ملت ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزئ پروانہ ہے
} اقبال با تغیرِ لفظی

دیکھ شمعِ لالہ و گل سے فروزاں کوہ و بن — وادئ سرسبز نے پہنے گلابی پیرہن
دیکھ بستانِ جہاں کے نرم و نازک نونہال — جن کے برگ و بار سے پیدا ہے نورِ لم یزل
کس قدر سرسبز ہیں شاداب ہیں دلشاد ہیں — گویا باغِ جنتِ ماویٰ میں یہ آباد ہیں

خواب یہ کیسا ہے اے مرغِ چمن بیدار ہو
گلستانِ زندگی میں پھر تو نغمہ بار ہو

کہہ ارباب فن اے سطوتِ دینِ مبیں — خواب سے بیدار ہو اے صاحبِ صدق و یقیں
دیکھ تیری منتظر ہے میری چشم سوگوار — خواب سے بیدار ہو اے میرے دُرِّ شاہوار

فطرتِ معصوم کے مطرب اٹھا اب ساز کو
کان سننا چاہتے ہیں پھر تری آواز کو

ہاں مجھے معلوم ہے تو کس لئے اٹھتا نہیں — کس لئے خاموش ہے تو صاحبِ صدق و یقیں
کس لئے یہ نالہ و شیون مرا بیکار ہے — کون سے نشے میں اے اقبالؒ تو سرشار ہے
آہ! سب معلوم ہے تو کس لئے بیہوش ہے — کیا سبب ہے ساز تیرا کس لئے خاموش ہے
کیا بتاؤں کس لئے آتا نہیں تو ہوش میں — بات یہ ہے تو پڑا ہے موت کی آغوش میں

آہ! تیرا ہوش میں آنا بہت دشوار ہے
کیونکہ جامِ مرگ سے اقبالؒ تو سرشار ہے

آہ! کیا ہے بس یہی تعبیرِ خوابِ زندگی — آہ! کیا ہے بس یہی شرحِ کتابِ زندگی
زندگانی آہ کیا ہے! موت کا پیغام ہے — آہ کیا آغاز کا اپنے یہی انجام ہے
روحِ آدم آہ کیا زندانی تقدیر ہے — اور کتابِ زندگی کی موت ہی تفسیر ہے
روح جب جسمِ خاکی سے جدا ہو جاتی ہے — کیا حقیقت ہے یہی کہ بس فنا ہو جاتی ہے
گر ترے نزدیک سرِّ زیست یہ بیہوش ہے — (زندگی کا راز تیری آنکھ سے روپوش ہے)
زندگی فانی نہیں ہے حضرتِ انساں تری — موت ہے انجام اس کا بھول ہے نادانی تری
آ بتاؤں تجھ کو میں رازِ درونِ کائنات — محو ہوتا ہے ابھر آتا ہے پھر نقشِ حیات

موت کیا ہے؟ روح کا اک عارضی آرام ہے
اور کیا معلوم اس آرام کا انجام ہے

محمد نواز شہید بی اے آنرز کلاس

کلامِ اقبالؒ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

ہر زماں یک تازہ جولاں گاہ مے خواہیم ازو — تا جنوں فرمائے من گوید دگر ویرانہ نیست

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکیگا حریفِ سنگ

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں طلب کر نوائے چنگ

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد — ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر

ہزار چشمہ ترے راہِ سنگ سے پھوٹے — خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بیقرار را — یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

بہ نگراں چہ سخن گسترم زجلوۂ دوست — بہ یک نگاہ مثالِ شرارہ مے گذرد!

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہی شوخیاں — نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سربسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا — ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملیگا نماز میں

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے — من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں سے نمازی بن نہ سکا

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں — جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا — نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

دنیائے دوں کی کب تک غلامی — یا راہبی کر یا پادشاہی!

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر — کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جبتک — نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

تو جنسِ محبت ہے قیمت ہے گراں تیری — کم مایہ ہیں سوداگر اس دیس میں ارزاں ہو

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر — بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا
جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
مے شود فرماں پذیر از دیگراں

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیر جہانِ دگر است

از غلامی دل بمیرد در بدن!
از غلامی روح گردد بار تن

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں ہوتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بیکار و زن تہی آغوش

در قبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار و خدا اندیش زی

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمے آید

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

स्त्री को मनुष्य समाज में कितनी उच्च पदवी दी गई है । भारत के प्रत्येक गृह में देवी की तथा लक्ष्मी की पूजा होती है । पुण्य जल वाली पवित्र भागीराथी में कौन भारत निवासी स्नान कर के आप आप को पवित्र नहीं समझता है । भारत में स्त्रियां देवी के नाम से सम्बोधित की जाती हैं । क्या ऐसा उच्च आदर्श, स्त्री जाति के लिये इतना सन्मान, किसी और जाति में दृष्टि गोचर है ?

आओ हम स्त्री जाति को, जिन पर कि भारत की शक्ति निर्भर है आदर सूचक शब्दों को सम्मान करते हुए उन्नति के पथ पर उग्रसर हों ।

भ० सुन्दर श्याम भाटिया

सम्पादकीय—

भक्त साहिब ने इस लेख में बड़े उच्च विचारों को प्रकट किया है । ऐसे प्रस्ताव हर पत्रिका में वाञ्छनीय हैं । आशा है कि भक्त साहिब भविष्य में भी ऐसे हितकारी प्रस्ताव भेज कर कृतार्थ करेंगे ।

योगीन्द्र नाथ

———:o:———

घृणा मनुष्य को कपट का मार्ग दिखला कर नीच बनाती है।

प्रेम मनुष्य को चिरायु होने में सहायता देता है घृणा जीवन से असारता उत्पन्न करती है।

प्रेम वास्तविक तथा आत्मिक ज्ञान का देवता है घृणा शरीर के साथ आत्मा को भी जला देती है।

भूषण देव
द्वितयि वर्ष

भारत में स्त्री जाति

कुछ समय की बात है कि अमेरिका की एक वृद्ध स्त्री ने भारतवर्ष पर एक पुस्तक लिखी है जिसका नाम मदर इन्डिया है। इस पुस्तक में उस ने भारतवर्ष के नर नारियों को जी भर कर कोसा है। क्या उस बुढ़िया को अपने देश की परिस्थिति विदित नहीं कि वहां पर क्या हो रहा है !? पाठक महानुभावों ने अनेकानेक पुस्तकों में पढ़ा होगा कि वहां पर स्त्रियों के नग्न नाच कराये जा रहे हैं। स्त्रियां के आचार पर बिना किसी संकोच के घात किये जाते हैं। ऐसे देश की एक बुढ़िया हमारे देश की देवियों के चरित्र पर कलङ्क लगाने का क्या साहस कर सकती है।

जो जाति जिस विचार और और वस्तु को श्रेष्ठ मानती है उस को वह अपना आदर्श ग्रहण कर लेती है। भारत निवासियों का आदर्श किसी से छुपा नहीं। पुराण, वेद शास्त्र अपितु सब ग्रंथ इस बात के साखी हैं कि

गीत

'पुजारी धर्म की लाज बचाओ'

हिन्दु धर्म है हिन्द की ज्योति—इस की ज्योत जगाओ।
पुजारी धर्म की लाज बचाओ।
हिन्दु धर्म है धर्म सनातन—इस का मान बढ़ाओ।
शान्त बना दे मोक्ष दिला दे—इस से प्रेम बढ़ाओ।
पुजारी धर्म की लाज बचाओ।
भारत माता की जै जै हो—हिन्द सपूत कहलाओ।
मनुष्य जन्म सफल हो मुरली—जो अपना धर्म निभाओ।
पुजारी धर्म की लाज बचाओ।

ऐम० ऐन० मुरली
द्वितीय वर्ष।

प्रेम तथा घृणा

प्रेम एक पुण्य है जो संसार रूपी उपवन में हर्ष की सुगन्ध का विस्तार करता है।

घृणा एक कांटा है जिस का स्थित्व इस संसार में पाप का चिन्ह है।

प्रेम इस संसार में मनोरञ्जकता तथा आकर्षण शक्ति उत्पन्न करता है।

घृणा मनुष्य में दोषों की वृद्धि करती है। प्रेम मनुष्य को प्राणि मात्र से सहानुभूति सिखाता है इस तरह उसे मनुष्य से देवता की पदवी तक हो जाता है।

पुस्तकों की ओर नहीं देखता और न ही उसे देखने के लिए समय मिलता है। सैनिमा में देखे हुए हालात उस के अन्तर अपना गृह बना लेते हैं। वहां पर वह क्या देखता है, यह कि नंगे नाच हो रहे हैं। स्त्री और पुरुष परस्पर प्रेम में मग्न हैं, या कोई किसी अन्य मनुष्य की स्त्री की मान हरण करना चाहता है। इस प्रकार के कई और बुरे विचार उत्पन्न करने वाली बातें देखता है। एक न एक दिन वह ऐसी बातों में फंस जाता है। इसका परिणाम यह होता है कि वह छोटी आयु में ही विवाह कर लेता है। इस से उस की स्मरण शक्ति नष्ट हो जाती है और वह कई वर्षों तक एक ही श्रेणी में रह जाता है या पढ़ाई को छोड़ कर भोग विलास में पड़ जाता है। छोटी आयु में भोग पिलास में पड़ना अपना नाश करना है। वह वहां सैनिमा में फैशन वाले मनुष्य देखता है और स्वयं उनका अनुसरण करता है। एक तो छोटी आयु में ही भोग विलास में पड़ने से वह सुस्त हो जाता है और दूसरा वह फैशन में पड़ जाता है। इस से स्पष्ट है कि वह धीरे २ अपने माता पिता का सारा रुप्या खर्च कर देगा। सुस्त होने से वह कमा भी नहीं सकता। अब खाये तो कहां से और पहने तो कहां से। उसे अपनी वृति के लिए भीख मांगनी पड़ेगी। देखो! सैनिमा ने एक विद्यार्थी को भीख मंगवाया। कहां वह एक विद्यार्थी की अवस्था में और कहां वह एक निर्धन फकीर की हालत में। अब स्पष्ट है कि सैनिमा से क्या क्या हानि होती है। यह बहुत ही बुरी बीमारी है इस से बचने का यत्न करना प्रत्येक विद्यार्थी का परम कर्त्तव्य है।

ओ३म् शम्॥

द्वारका दास

द्वादश श्रेणी

सैनिमा का विद्यार्थी जीवन पर प्रभाव

लोग कहते हैं कि इन दिनों संसार उन्नति के शिखर पर पहुंच चुका है परन्तु मैं चकित होता हूं कि यह लोग किस भाव से संसार को उन्नति शील कहते हैं। आज कल जो वस्तुएं हैं, क्या वह पहले न थीं? अवश्य थीं परन्तु उन के नामों में भेद था। मैं यह साहस से कहता हूं कि पुराने ज़माने की चीज़ें आज कल देखने को नहीं मिलती। रामायण में आया है कि श्री रामचन्द्र जी विमान पर सवार होकर लंका से अयोध्या आए थे केवल एक दिन में। परन्तु आज कल कोई ऐसा दृष्टान्त नहीं मिलता कि किसी विमान ने एक दिन में इतना बड़ा सफर किया हो। महाभारत में लिखा है कि अन्धा धृतराष्ट्र घर बैठे ही संग्राम के वृत्तान्त सुन रहा था। आज कल यह काम रेडियो से ले रहे हैं।

लोग कहते हैं कि आज कल सैनिमा है, परन्तु पिछले ज़माने में सैनिमा की कोई मिसाल नहीं मिलती। सच्च है, क्योंकर मिले। मैं उन से पूछे बिना नहीं रह सकता कि सैनिमा से क्या लाभ हैं और इस से क्या क्या हानियां हो रही है। सैनिमा से लाभ की अपेक्षा हानियां वहुत है। तो फिर क्योंकर ऐसी हानिकारक वस्तु पिछले ज़माने के लोग शुद्ध भाव रखते थे, परन्तु आज कल सौ में से पांच ऐसे मनुष्य हैं, जो मनुष्य कहलाने के योग्य हैं। आज कल के लोग मनुष्य नहीं, अपितु राक्षस हैं। यह राक्षस मनुष्य देहधारी वन कर पृथ्वी पर पाप के बीज बो रहे हैं। ऐसा क्यों है? इसलिये कि सैनिमा जैसी हानिकारक वस्तु उत्पति में आ गई है। अब मैं उन लोगों से जो कि संसार को उन्नतशील कहते हैं, पूछूंगा कि क्या संसार उन्नतशील है। उत्तर यह मिलता है कि संसार अवनति की ओर जा रहा है।

सैनिमा का प्रभाव विद्यार्थियों पर बहुत बुरा पड़ता है। एक विद्यार्थी जो सैनिमा देखने का बड़ा इच्छुक होता है कभी भी अपनी

श्री कृष्ण बैठे थे, खड़े हो गये और बोले, "सुन्दरी ! मुझे तुम्हारे लिये स्थान मिल गया।"

"कहां ?"

कवि का कलेजा धड़कने लगा, श्री कृष्ण ने कहा, "इस कवि के हृदय में जा कर रहो।"

कवि ने सिर झुका दिया। उस की वीणां के तीरों से झङ्कार का शब्द निकला। कमल की बेटी सौन्दर्य के कटाक्ष से आगे बढ़ी और कवि के हृदय प्रविष्ट होने लगी। परन्तु एका एक पीछे हट गई। इस समय उस का मुख मण्डल भय से हिम की भांति सफ़ेद था। श्री कृष्ण को आश्चर्य हुआ और कहा—"क्या तुम वहां भी डरती हो ?"

कमल की बेटी की आंखों में आंसू लहराने लगे। उस ने गद २ हो कर कहा "महाराज ! आप ने मेरे लिये कैसा स्थान चुना है। वहां तो गगन भेदी पर्वतों की हिम से फटी हुई ऊंची २ चोटियां, भयानक तरङ्ग वाले समुद्र की तरायां, शून्य बनों का सन्नाटा और हिमालय की अंधेरी गुफ़ायें, सब कुछ विद्यमान हैं। मैं वहां कैसे रहूंगी ?"

श्री कृष्ण ने उत्तर दिया—न डरो ! सुन्दरी न डरो ! डरने का कोई कारण नहीं। तुम सुन्दरी हो, तुम्हारा आसन कवि का हृदय है। यदि वहां हिम है, तो तुम सूर्य्य बन कर उसे पिघला दो। यदि वहां समुद्र है, तो तुम मोती बन कर उसे चमका दो। यदि वहां एकान्त है, तो तुम समूघर संगीत आरम्भ कर दो, सनाटा टूट जायगा। यदि वहां अंधेरा है, तो तुम दीपक बन जाओ। अंधेरा टूट जायेगा।

कमल की बेटी इन्कार न कर सकी।

* ओं शम् *

मदन मोहन

एकादश श्रेणी

"वहां एकान्त है, इस से मेरा रक्त नाड़ियों में जम जायेगा।"

श्री कृष्ण ने माथे पर हाथ फेरा। इस समय उन का चित बहुत उदास था उन्हों ने अपनी बांसुरी निकाली, और उसे बजाने लगे।

——

रात्रि बीत गई। सूर्य्य की किरणें जल पर नाचने लगी। सरोवर का जल, ताड़ के पत्ते, वृक्षों पर रहने वाले पक्षी, निद्रा से जागे। प्रकृति मे नये सिर से जान आ गई।

श्री कृष्ण ने कहा, 'यह कवि है।'

सरोवर के निर्मल जल पर एक लम्बी छाया दिखाई दी। वायु में किसी की मदभरी तान गूंजी। हरी २ घास पर किसी के पांव की हलकी २ चाप सुनाई दी। और थोड़ी दूर पर एक नवयुवक हाथ में वीणा लिये आता दिखाई दिया। श्री कृष्ण ने उसे देखा, और फिर दोबारा कहा, यह कवि है।

कवि समीप आया—एक दूसरा सूर्य्य उदय हो गया। उस ने कमल की बेटी को देखा तो वीणा उसके हाथ से गिर गई और पांव भूमि में गड़ गये, जैसे किसी ने उन में बेड़ियां डाल दी हैं। श्री कृष्ण ने कमल के फूल को जीती जागती लड़की बनाया था, लड़की के अनुपम लावण्य ने कवि को आश्चर्य की मूर्त्ति बना दिया।

श्री कृष्ण ने पूछा—"कवि क्या हाल है?"

कवि ने चौक कर वीणा संभाली और सिर झुका कर उत्तर दिया—"मैं प्रेम करता हूं, प्रेम के पद बनाता हूं, और प्रेम का संगीत गाता हूं—मेरे जीवन का एक २ क्षण प्रेम के लिये अर्पण हो चुका हुआ है।"

यह कहते २ कवि ने कमल की बेटी की ओर प्यासे नेत्रों से देखा।

कमल के फूल ने जल में डुबकी लगाई और एक सुन्दरी अपने पंखड़ियों के सदृश कोमल वस्त्र निचोड़ती हुई बाहर निकली।

श्री कृष्ण का हृदय प्रसन्नता से धड़क रहा था। उन्होंने कपल की बेटी को देखा और कांपती हुई आवाज़ में कहा–

"पहले तुम कमल का निर्जीव फूल थी, अब तुम कमल की बेटी हो, बातें करो।"

कमल कुमारी ने सिर झुका कर बोलना आरम्भ किया, वायु में सुगन्ध भर गई–"महाराज! मैं आप के आदेश से उत्पन्न हुई हूं, आप की आज्ञा का पालन करूंगी, कृपया कहिये, मैं कहां निवास करूं?

श्री कृष्ण ने चन्द्रमा की ओर टकटकी लगा कर देखा और उत्तर दिया—"पुष्पवाटिका में।"

"महाराज! वहां वायु फूलों को तोड़ डालती है।

"क्या तुम पर्वतों की ऊंची चोटियां पसन्द करोगी?"

"वहां बर्फ़ है, शीत से मेरा हृदय कांपने लगेगा।

"अच्छा तुम समुद्र तल में वहां मैं तुम्हारे लिये मूंगा का महल बना दूंगा।

"परन्तु वह बहुत गहरा है।

श्री कृष्ण ने मुस्करा कर पूछा–"तो फिर तुम्हें कहां रखें, क्य हिमालय की कन्दरा में?"

कमल की बेटी का अङ्ग २ थर्रा गया उस ने कांपते हुये कहा– वहां अंधेरा है।

कमल के फूलों के पास, जल के ऊपर? वहां काई है।

निर्जन बनों में?

कमल की बेटी

रात्रि का समय था, चन्द्रमा की धवल किरणें पृथ्वी को अपनी शीतल चान्दनी में स्नान करा रही थीं। श्री कृष्ण ने ठंडी सांस भरी और कहा—मेरा विचार झूठा निकला। मनुष्य संसार का सर्वोत्तम पदार्थ नहीं, कमल का यह फूल जो वायु के झोंकों के साथ क्रीड़ा कर रहा है, उस से कहीं अधिक मनोहर और दृष्टि को अपनी ओर आकृष्ट करने वाला है। उस की पंखड़ियां कैसी सुन्दर हैं, उस का रङ्ग कैसा मनोहर है, उस का रूप कैसा अनुपम और नयनाभिराम है। सौन्दर्य के बाज़ार में यह निर्जीव पुष्प सकल संसार की सब से अधिक रूपवती कामिनी को भी परास्त कर सकता है। प्रत्युत यदि जगत का सम्पूर्ण सौन्दर्य एक स्थान पर एकत्र कर दिया जाये, तब भी उस में यह मोहिनी नहीं आ सकती, जो इस अकेले फूल के अन्दर समाई हुई है। मैं चाहता हूं कि इस प्रकार की एक लड़की उत्पन्न करूँ, जो मनुष्यों में ऐसी हो, जैसे फूलों में कमल। जिस से संसार के अंधेरे कोण जगमगा उठें, और जिस के सन्मुख श्यामा का सङ्गीत भी मन्द पड़ जाये।

यह सोच कर श्री कृष्ण कुच्छ चण चुप रहे, और फिर एकाएक अपनी सांवरी अंगुली उठा कर बोले—"हे कमल, एक सजीव सुन्दरी के रूप में बदल जा, और फिर मेरे सामने खड़ा हो।"

जल की लहरों ने अपने आप को सरोवर के तटों के साथ टकराया। रात्रि अधिक सुन्दर हो गई। चन्द्रमां की किरणें अधिक प्रकाशमान हो गईं। सरोवर का जल मोतियों के समान चमकने लगा, मानो चन्द्रमा को शान्दनी उस में हल हो गई। सोती हुई चिड़ियां अपने प्राणों की सम्पूर्ण शक्ति से गाने लगीं, और कुच्छ देर के बाद सहसा चुप हो गईं।

प्रभु जी! क्या पूर्व जन्म में हम ने इतने नीच कर्म किये थे जिन का फल हमें इस जन्म में मिल रहा है। पिता जी। अब हमें क्षमा करो। त्रुटियां मनुष्य ही में पाई जाती हैं। हमारी इन त्रुटियों की ओर ध्यान न देकर हमें इस दरिद्रता के दुःख से बचाओ स्वामी जी, हमें निर्धन बना कर हमारी परीक्षा न ले। यदि यह दरिद्रता इसी प्रकार मनुष्य जाति में रही तो एक दिन ऐसा जायगा कि इसे कोई मनुष्य जाति ही न कहेगा। नाथ जी। हमें इस दरिद्रता के रोग से बचाओ, बचाओ नहीं तो यह जाति..................।

प्यारे वीरो! उठो और इस दरिद्रता का सामना करने के लिये उद्यत हो जाओ। कोई बात नहीं यदि तुम्हारा सत्कार नहीं होता। कोई बात नहीं यदि समाज तुम्हें अपने साथ मिलाने के लिये तैयार नहीं है। तुम्हें इस बला को दूर करने के लिये सिर्फ़ एक कार्य ही करना चाहिये उस का नाम है 'परिश्रम'। परमात्मा भी उन की मदद करता है जो अपनी मदद आप करते हैं। उठो और शरम के परदे को अपने मुख से हटाओ और मैदान में निकल आओ। यह तुच्छ सी दरिद्रता क्या बिगाड़ करती है। तुम्हें तो अपनी आयु में ऐसे हज़ारों शत्रुओं से सामना करना होगा। यदि यहां ही हार कर बैठ गए तो जीवन व्यर्थ है। अपने हाथ पैरों को काम में ला। प्रभु ने तुझे यह दिये ही इस लिये हैं कि इस से कुछ काम ले।

'ले हिम्मत से काम रे बन्दे जीवन है संग्राम'।

H. Raj Biblani,
I Year.

---

*

निर्धनता

{ एक निर्धन मनुष्य किसी वृक्ष के नीचे बैठा हुआ है
और अपने आप ही बातें कर रहा है। }

धन वालों की दुनियां है यह निर्धन का भगवान!

अरे निर्धन! तेरी इस संसार में जहां तुझे कोई पूछता ही नहीं आने की क्या आवश्यकता थी। हर समय और हर एक स्थान पर तुझे धिक्कारा जाता है। किसी के हृदय में भी तेरे लिये कोई सम्मान नहीं है। तू ही सब पापों का मूल है। तू ही है जिस के लिये समाज में कोई स्थान नहीं। तू ही समाज में मूर्ख, नीच और दलित के नामों से पुकारा जाता है। तू ही है जो आत्म हत्या तक करने को उद्यत हो जाता है। तुझे अपना जीवन अपने लिये ही दूभर प्रतीत होता है। संसार में तू ऐसे विचरता हुआ प्रतीत होता है जैसे कोई गली का श्वान हो। घर २ की झूठ को खाना तेरा कार्य है। अरे मूर्ख! बता ऐसी अवस्था में तू यहां क्यों आया? तेरा यहां क्या काम था? जितनी जल्दी हो सके तू यहां से चल दे। तुझे इस संसार में रहने का कोई अधिकार नहीं है। तू तो मनुष्य जाति से भी बाहर है।

अरी निर्धनता! तू कितनी निर्दई है। क्या तू ने कोई ऐसा पाप छोड़ा है जो मनुष्य ने तुझ से छुटकारा पाने के लिये न किया हो! तू ने क्यों हमारे गले को दबोचा हुआ है? मनुष्य जन्म धारण करने का लाभ ही क्या है जब कि तू हमारे पीछे छाया के समान लगी हुई है! कृपा करके अब हमारा पीछा छोड़। हम तुझ से बहुत तंग आ चुके हैं।

अपनी विजय रूपी पताका लहरा सकते हैं। यदि अब भी सोये रहे तो रुदन कर के हमें यह कहना पड़ेगा।

'जब चिड़ियों ने चुग खेत लिया फिर पछताये क्या होवत है।

नेम राज
१म वर्ष

प्रीतम ! प्रेम का सार अपार।

प्रेम की है यह डूंगी नदिया प्रेमी इस का नाव खवैया।
प्रेम नाव में बैठ के दोनों पार करें मंझधार।
प्रीतम ! प्रेम का सार अपार।

पार बसत है नगरी सुन्दर प्रेम का उस में बनायेंगे मन्दिर।
तुम बन जाना प्रेम पुजारिन मैं तेरे बलिहार।
प्रीतम ! पार का सार अपार।

छाई है यह कारी घटैरया क्यों डोलत यह प्रेम की नैया।
ओ नैया के खेवन हारे मत छोड़ो मंझधार।
प्रीतम ! प्रेम का सार अपार।

प्रेम की अग्नि, प्रेम पवन है जैसे पुष्पों का उपवन है।
प्रेमी जन इस द्वीप में रहते प्रेम का यह संसार।
प्रीतम ! प्रेम का सार अपार।

योगीन्द्र, तृतीय वर्ष।

---

*

अन्ध अभिमानियों के मद तथा गर्व को चूर किया। परन्तु सब दिन होत न एक समान। जब हमारी इतनी शिथिल तथा शोचनीय अवस्था हो गई है कि पहचाने भी नहीं जाते।

हाथ होते हुए भी हमारे में कर्म शक्ति नहीं, पांव होते हुए चल नहीं सकते। कान होते हुए श्रवण नहीं कर सकते। आंखें रखते हुए भी बुरे और भले में भेद नहीं पा सकते। आस पर ओस पड़ गई है। समझ चल बसी है। मत मारी गई है। होश होश्यार पुर भाग गई है। पत पानीपत चली गई है परन्तु कानों पर जूं नहीं रींगी।

हमारे घरों में फूट घर कर चुकी है। भाई भाई का रुधिर पीने को उद्यत है। घरों में फूट के बिना कुछ दृष्टि गोचर नहीं है। आज धनाढ्य निर्धनों यतीमों विधवाओं को लूट कर आप को पाल रहे हैं उन के लहू से होली खेली जा रही है। इस प्रकार का अन्याय और उपद्रव हमें अवन्नति के गढ़े में खेंचे जा रहा है। हम आकाश के सितारे तोड़ना चाहते हैं पर देश के सितारे काम नहीं आते। हम पालिश पर अधिक सुन्दर रंग चढ़ाना चाहते हैं पर पहिले को भी बदरंग कर देते हैं। हम हम जाति का सुधारने का दावा करते परन्तु स्वयं नहीं सुधरते। जाति को जीवित करना चाहते हैं। परन्तु आप स्वयं शव सम हैं। इस प्रकार की शिथिलता हिन्दु जाति के लिये भुलैयां है।

संसार में सर्व कार्य मिलाप से होते हैं, असंघटन के कारण ही महा भारत का युद्ध हुआ जिस की हानि की पूर्ति आज तक भी नहीं हो सकी भारत वर्ष इस फूट के कारण पराधीन बन चुका है। अब भीसमय है। गया कुछ नहीं। यदि आज भी हम जागृत हो जायें तो सारे संसार में

प्रेम वियोग

सजनी हीन हमारे भाग

शोभा है उपवन की न्यारी फूल खिले है डारी डारी।
बागों में मिल जुल कर सखियां नाचें, खेलें फाग।

सजनी हीन हमारे भाग

गरजत बादल वर्षत वर्षा पी पी करता मस्त पपीहा।
आमों पर मतवाली कोइल गाये प्रेम का राग।

सजनी हीन हमारे भाग

झरने का वह कल कल करना सखियों का यह पानी भरना।
चन्दा की शीतल किरणों से उठे प्रेम की आग।

सजनी हीन हमारे भाग

शरद ऋतु की सुन्दर रातें तेरी मेरी उन्मत बातें।
नैन मिले थे जब आपस में याद है बीता फाग।

सजनी हीन हमारे भाग

म० सुन्दर श्याम
भूतर्श्व विद्यार्थी

काम की बातें

कोई दिन था कि हम कुछ थे। हमारी शक्ति इतनी थी कि हम जो चाहते कर सकते थे। ऐसी कोई बात व कोई काम न था जो हम से न हो सकता था। सृष्टि में सारे हमारे ही नाम लेवा थे। सारे जगत में हमारे धर्म का संचार हुआ हुआ था। यह हम ही थे जिन्होंने अन्धकार में उजाला किया, मुर्दों को जीवित किया, शुष्क नसों में नव रुधिर की धारा बहा दी, भूले भटके संसार को ज्ञान रूपी सत्य का मार्ग दिखाया, बड़े २

ठहरो ! नीच विचारों को अपने अन्दर कभी स्थान मत दो । उन विचारों को कभी अपने मन में न लाओ जिन को जबान पर लगने से या लिखने से तुम संकोच करो ।

ठहरो ! बिना सोचे क्रोध में बात कह दी जाती है समय पाकर विष की पुड़िया बन जाती है । जो धीरे धीरे बुरे प्रभाव को पैदा कर देती है जिन का कहते समय तुम को सपना तक नहीं आया था । सर्वदा बात को तोल कर बोलो, क्योंकि कहने का बोझ तुम पर है ।

ठहरो ! अपने मन में बुरे विचार न रख कर अपने आप को पाप कर्मों से बचाओ और ध्यान रखो कि इस प्रकार अपने आप को बचाने और आत्मा को शुद्ध रखने में तुम ने बड़ा काम किया है । अपने नित्य के धर्म का तुम ने उचित प्रकार से पालन किया है । उस समय तुम्हें अनुभव होता है कि पाप करना अवाञ्छनीय है । पृथ्वी स्वर्ग प्रतीत होती है ।

मदन लाल (चतुर्थ वर्ष)

—o—

*

ठहरो

(मनुष्य से अनुवादित)

ठहरो! अपने आप को बड़ा समझाने की असफल चेष्टा मत करो स्मरण रखो कि उच्चता सर्वदा नम्रता के साथ साथ चलती है। भला मनुष्य वही है जो चार का ग़म खाता है। ज्यादा ऐंठ २ कर चलने वाले गौरवहीन मनुष्यों को ही प्राप्त करेंगे।

ठहरो! अपने शब्दों में, निगाहों में तथा कार्य्यों में उदासीनता मत प्रकट करो। ऐसा करने से लोग तुम्हारा कुछ भी मान न करेंगे। तुम्हारा जीवन सुनसान सा हो जायगा।

ठहरो! किसी कार्य को पूरा करने में व्यर्थ विलम्भ से कुछ भी न करना अच्छा है। ऐसी देर करने वालोंपर अन्त में किसी का बिश्वास नहीं रहता।

ठहरो! किसी पुरुष को उस के वस्त्र व चाल से मत जांचो, सभी श्वेत वस्त्र धारी शुद्ध चित के नहीं होते हैं।

ठहरो! जिन बातों को तुम अपने लिये बुरा समझते हो उन्हीं को दूसरे में भी बुरा समझ कर उन से घृणा मत करो, प्रकृति सब मनुष्यों की एक सी नहीं होती।

ठहरो! किसी ऐसे खेल को मत खेलो जो तुम्हारी पदवी के लिये अनुचित हो।

ठहरो! किसी ऐसी समाज में मत प्रवेश करो जिसके नियमों को तुम नहीं जानते। कहीं ऐसा न हो "आये थे हरि भजन को एटन लगे कयास"।

तेरे नैन मेरे मुतलासी—तू मेरे दर्शन की प्यासी।
कहती मेरे प्रेम प्यारे आओ तो इक बार।
सजनी! कहां गया वह प्यार?

मुझ को ही इक मीत बना कर—जग में सब से वैर कमा कर।
खेल में प्रीत की बाजी सजनी गई तू मुझ से हार।
सजनी! कहां गया वह प्यार?

तू मेरी थी प्रेम की नैया—मैं जिसका था प्रेम खवैया।
इक दूजे के आश्रे तू मैं पहुंचे थे मंझ धार।
सजनी! कहां गया वह प्यार?

जाने क्यों खड़ी तू पल में—औगण कौन लखा निर्बल में।
मुझ निर्दोष को दोष लगा कर तज बैठी हो प्यार।
सजनी! कहां गया वह प्यार?

ज्यूं बछड़े बिन गाय बिल्कत—त्यूं मन मोरा तुझ बिन तड़पत।
कसम है सिर तेरे की तुझ बिन नहीं किसी से प्यार।
सजनी! कहां गया वह प्यार?

कौन तुझे आकर समझाये—बीती बातें याद दिलाये।
अपना हाथ मुझे पकड़ा जब कहती थी 'कर प्यार'।
सजनी! कहां गया वह प्यार?

तज दीनी तेरी भी चिन्ता—तज दीनी झूठी जग ममता।
अब तो ज्ञान से प्रकाशित हो चला प्रभु के द्वार।

मुरली चला प्रभु के द्वार?

ऐम० ऐन० मुरली भट
द्वितीय वर्ष।

होने वाले विद्यार्थियों की संख्या अन्य भाषाओं की १० परिक्षाओं में शामिल होने वाले विद्यार्थियों में १० वार अधिक है। परन्तु फ्रान्टियर और सिन्ध में हिन्दी भाषा की अवस्था अत्यन्त शोचनीय है।

आवश्यकता है कि पञ्जाब, सिन्ध आदि प्रान्तों में हिन्दी का प्रचार बढ़ाने के लिये लोक रुचि के अनुसार सरल भाषा में साहित्य तय्यार किया जाय। दैनिक, साप्ताहिक तथा मासिक पत्रों व पत्रिकाओं का सस्ते मूल्य पर विशेष प्रबन्ध किया जाय। छोटे बच्चों के लिये उर्दू के स्थान पर हिन्दी आवश्यक विषय बना दिया जाय। सर्व हिन्दु स्कूलों में हिन्दी द्वारा ही शिक्षा दी जाय। हिन्दी पढ़ने वालों को राज्य तथा जनता की ओर से सर्व प्रकार की सुविधायें दी जायें।

वणिक जन मे आग्रह किया जाय कि वह अपने लेबलों लिफ़ाफ़ों, पोस्टरों और पर्चों पर देव नागरी लिपि में हिन्दी लिखा करें, सर्व साधारण जनता से अपील की जाय कि वह अपना पत्र व्योहार, अपना हिसाब किताब हिन्दी में रखें। सर्व हिन्दी प्रेमियों को लिफ़ाफ़ों और पोस्ट कार्ड पर हिन्दी में ऐडरस लिखने चाहियें। ऐसा करने के लिये लोगों को प्रोत्साहन देना अत्यावश्यक है।

भक्त सुन्दर श्याम

भूत शर्वविद्यार्थी

शुरली का गीत

कहां गई वह प्रीत सजनी— कहां गया वह प्यार ?

याद भी हैं तुझ को वह रातें—रो रो कर होती परभातें।

तूने प्रेम सन्देसे लिख लिख भेजे थे कई बार।

सजनी ! कहां गया वह प्यार ?

है जहां अन्य भाषायें बोली जाती हैं। हिन्दी का जन्म वीर रस का संचार करने के लिये हुआ। हिन्दी के आदि कवि चन्द्र बरदाई पृथ्वीराज के विश्वास पात्र वीर सेनापतियों में से थे। उन के रासो और भारत भारती के पढ़ने से पता चलता है कि हिन्दी को वर्तमान स्थान प्राप्त करने में अनेकानेक परिवर्तनों में से गुज़रना पड़ा है। रासों में प्रान्तीय भाषा के शब्दों की भरमार है परन्तु उन के बाद वाले कवियों की कृतियों में वेघटते गये। १५वीं शताब्दी गुसाईं तुलसी दास और रहीम ने जिस भाषा का प्रयोग किया वह बहुत शुद्ध भाषा है। बिहारी ने भी इस भाषा का प्रयोग किया। वर्तमान हिन्दी, तुलसी, लल्लूलाल, रहीम, बिहारी, कबीर की भाषा का शुद्ध स्वरूप है। इन सब विद्वानों ने पद्य रचना द्वारा ही हिन्दी की सेवा की। भक्ति शृङ्गार, वीर रस पर हिन्दी में जितना कुछ काव्य साहित्य उपलब्ध है उतना संसार की शायद ही किसी और भाषा में हो। यही कारण है कि रामायण का मुद्दत से अङ्गरेज़ी अनुवाद हो चुका है। ग्रफ़िथ साहिब ने इसे संसार की श्रेष्ठतम रचनाओं में से बताया।

स्वामी दयानन्द सरस्वती प्रथम महापुरुष थे जिन्होंने हिन्दी में गद्य लिखने का रिवाज जारी किया। आज उनके परिश्रम का परिणाम है कि आज भारत के राष्ट्र नेता हिन्दी को ही राष्ट्र भाषा बनाना उचित समझते हैं। इस सम्बन्ध में अखिल भारतीय हिन्दी साहित्य सम्मेलन ने जो प्रयत्न किये हैं वह प्रशंसनीय हैं। मदरास में पिछले २० साल में लाखों आदमी हिन्दी लिखना पढ़ना सीख गये हैं। देश भर के विश्व-विद्यालयों में भी शिक्षा का उच्चतम प्रबन्ध है। समाचार पत्रों और बोलने वाली फ़िल्मों द्वारा हिन्दी को अभूत पूर्व सहायता पहुंची है।

वैसे तो हिन्दी प्रचार के लिये जितना कार्य किया जाय वह थोड़ा है और विशेष कर पञ्जाब, सिन्ध और फ्रान्टियर में। यह सुन कर किसे न हर्ष होगा कि पञ्जाब में हिन्दी की तीन परिक्षाओं में प्रविष्ट

चांद की किरनें बन कर तेरे, मुख पर मुकुट सजाऊं।
कभी लगाऊं, कभी हटाऊं, सहरा कभी हटाऊं।
जब तू सूरज बन, मैं झट ज़रा बन जाऊं।
छन छन ज्योत की वर्षा देखूं, तेरे दर्शन पाऊं॥ ६॥

———

हिन्दी भाषा

संसार में हर एक देश की अपनी भाषा और अपनी लिपि है अपनी भाषा को उन्नत किये बिना संसार के किसी भी राष्ट्र ने आज तक उन्नति नहीं की, अपने साहित्य के बिना कोई भी राष्ट्र जीवित नहीं रह सकता। और ऐसा साहित्य जिसे अपना कहा जा सके तब तक तय्यार नहीं हो सकता जब तक अपनी भाषा और लिपि उन्नत न हो। किसी भी उन्नत देश में जाइये वहां पर आप के उस देश की अपनी लिपि और अपना साहित्य मिलेगा। जहां इस का अभाव है वहां उन्नति का भी अभाव है।

आठवीं शताब्दी तक भारत में संस्कृत का ही प्रचार था। यहां का सारा साहित्य संस्कृत में था। लिपि देव नागरी थी यवनों का आगमन होते ही संस्कृत का लोप हो गया। उन के संसर्ग में एक नई भाषा का जन्म हुआ जिस में लोक प्रचलित शब्दों का आधिक्य था। वह हिन्दी कहलवाई। इस की लिपि वही देव नागरी लिपि ही रही। भारत की ३८ करोड़ आबादी में से प्रायः ३० करोड़ ऐसे लोग हैं जो हिन्दी बोलते, लिखते, पढ़ते और समझते हैं। अब तो हिन्दी अपनी सरलता, उपयोगिता और पूर्णता के कारण उन प्रान्तों में भी अधिकार जमा रही

अभिलाषा

(प्रो० ऐफ़० ऐम० शुजा मुनमी)

सुन्दर फूल बनूं मैं, गुल शहज़ादी रूप बनाऊं।
तू तोड़े और नैन मिलाये, मैं गुप चुप हो जाऊं।
हंस हंस कर फिर देखूं, चुपके चुपके नैन मिलाऊं।
प्यार भरे नैनन में घुस कर, तेरे दर्शन पाऊं॥ १॥

सुन्दर चञ्चल चिड़िया बन कर डाल डाल पर गाऊं,
चारों ओर मैं तेरे लेकिन कभी भी हाथ न आऊं।
सुद्ध बुध तुझ को रहे न इतना, मीठा गीत सुनाऊं,
इस मस्ती की सरशारी में तेरे दर्शन पाऊं॥ २॥

बन कर सावण वर्षा, बूंदें सहज सहज वर्षाऊं।
ठंडी छाओं बन कर तेरे, सारे देश परछाऊं।
जंगल मंगल कर दूं, इस धरती को स्वर्ग बनाऊं।
जब तू झूला झूले, आऊं तेरे दर्शन पाऊं॥ ३॥

धीमी धीमी वायु बन कर तेरे दर पर आऊं।
रोके सखियां, रोकें जा कर, मैं न सकूं, घुस जाऊं।
मेरा देवता मस्त नींद में, क्यों मैं अब शरमाऊं।
देखूं, देखूं और जी भर कर, तेरे दर्शन पाऊं॥ ४॥

कृष्ण कन्हैया तुझ को बनाऊं, मैं मुरली बन आऊं।
कुछ ही बजाय तू लेकिन, मैं एक ही राग सुनाऊं।
प्रीतम प्यारे, यह तो बताओ, मैं कैसे तुझे रिझाऊं।
रूप में मोहन, मुरली धर के, तेरे दर्शन पाऊं॥ ५॥

ओ३म्

सम्पादकीय विचार

संसार में सर्व कार्य सहयोग से सम्पादित हुआ करते हैं । हमार महा विद्यालय की पत्रिका भी हिन्दी प्रेमी छात्र गणों तथा उत्साहित लेखकों की सहायता से उज्जवल पथ पर उग्रसर हो सकती है । परन्तु अत्यन्त खेद से लिखना पड़ता है कि लेखक हमारी पत्रिका की उन्नति के अभिलाशी होते हुए भी लेख भेजने की कृपा नहीं करते ।

इस में कुछ सन्देह नहीं कि छात्र गण अब कुछ अधिक उत्साह के साथ हिन्दी विभाग में हिस्सा लेने लगे हैं । वैसे तो सर्व श्रेणियों के विद्यार्थियों तथा हमारे कालजके भूतश्र्व विद्यार्थियों ने भी अपने लेखों द्वारा इस पत्रिका को सुशोभि त किया है परन्तु १म वर्षीय विद्यार्थियों के लेख देख कर मन में हर्ष रूपी समुद्र मौजें मारना प्रारम्भ कर देता है, जहां मैं अपने अपने इन भ्राताओं को, जो कालेज तथा इस हिन्दी विभाग के आशाजनक स्तम्भ हैं, वर्धायन दूंगा वहां मैं उन के सहचरों से आग्रह करूंगा कि वह पत्रिका के लिये सुन्दर लेख लिख कर अपनी मस्तिष्क शक्ति को विकासित करें ।

अन्त में सर्व लेखकों का धन्यवाद करता हुआ आशा करता हूं कि अगले अंक के लिये वह अधिक उत्साह के साथ लेख लिखेंगे । यदि इस अंक में १० प्रस्ताव हैं तो अगले में २० होने चाहियें । और यह तभी हो सकता है जब हम सब एकत्र हो कर, उस भाषा की उन्नति में, जिजको हम निकट भाविष्य में सर्वाङ्ग परिपूर्ण विश्व विजयी साहित्य की जननी के रूप में परिणत करना चाहते हैं, व्यग्र हो जायें ।

योगीन्द्र नाथ

सम्पादक

---

* ओ३म् *

निरीक्षक :-

प्रो० मदन सिंह शास्त्री

सम्पादक :-

योगीन्द्र नाथ

सहकारी सम्पादक :-

बिशन दास

सादिक इजरटन कालेज

के

मेगज़ीन

का

हिन्दी विभाग

ओं सहनाववतु, सहनौ भुनक्तु, सहवीर्यं करवावहै ।
तेजस्विनावधीत मस्तु, मा विद्विषावहै ॥

अप्रैल १९४१

विषय सूची

Reviews

"TABASSUMAT," by Abdul Hamid Arshad.

At the present moment when blind materialism with its ruthless bitterness and hatred threatens to sweep humanity into extinction, the restoration of a deep reverence for human personality and a spirit of humility and large-heartedness is urgently called for. The artist, rendering his moods and experiences with sharpened senses and heightened emotions, detects significance where others fail to be impressed, and creates the disposition of mind, the breadth of temper which views the various interests of life in their proper perspective. To-day we need the temper of a man of letters, not as an end in itself but as an instrument of the art of living. Such an artist is our poet Arshad, the author of "Tabassumat." We commend the book to all interested in poetry both as a fine art and as 'an instrument of the art of living.'

MOHD. NAWAZ SHAHID.

In Memoriam

We are sorry to record the death of the Hon'ble Justice Dr. Sir Shah Mohammad Sulaiman, M.A., LL.D., Vice-Chancellor, Muslim University, Aligarh. Sir Sulaiman was one of the greatest judges of the country and a first-rate scientist of international recognition. Besides, he was a great educationist, and as a Vice-Chancellor of the Muslim University was highly esteemed because of his erudition and administrative capacities. In his death India has lost her greatest justice, the world a great scientist, and Islam one of her noblest sons.

We keenly feel his loss and offer our heartfelt sympathies to the members of his family on their sad bereavement, and pray that his soul may be blessed.

Hail to thee O Muharram !
Hail to thee O New Year !

Hence
Ring out, wild bells, to the wild sky,
The flying cloud, the frosty light;
The year is dying in the night;
Ring out, wild bells, and let him die,
Ring out the old, ring in the new.

Prof. M. D. HASSAN.

cursed Yazid, the seventy-two dear and brave sons of Islam fell fighting one by one, the very babes sucking at the breasts of their starving mothers shot dead by arrows ! It was the most pathetic and heart-rending spectacle in the annals of the world, and yet the most important battle fought on the borders of the Right and the Wrong. Islam got a new lease of life through the life-blood of the great martyrs of Karbala.

Our Grand Prophet, Ibrahim (peace be on him) may be proud of simply putting a knife at the neck of his son, Ismail (peace be on him), in obedience to God's orders in his dream—in memory of which we celebrate Eid-ul-Baqar—but prouder still would be the beloved Prophet of ours (peace be on him) for whose Islam his daughter's son not only sacrificed his own life, but also the lives of all his kith and kins.

Here begins the New Year of Islam, the real life-spring of Islam, with the month of Muharram, with the proudest records of sacrifices, uneffaced and unaltered in the glorious pages of history.

Other communities may welcome their New Years with the intoxicating cups on their lips, tossing on the cosy cushions of luxury, but a true Mussalman is far from that. He has to solemnly vow to stand at all costs, against the Wrong. He has to resolve to trample down the obstacles of circumstances or of times, and with the strong spirit of sacrifice and iron will to conquer the goal of life and "never to yield." So

It is the dawn of Muharram that spread light of Islam in the darkened corners of the world, the dawn under the pregnant light of which went the greatest Man of the Earth —"the Hero as a Prophet,"—from Mecca to Medina, not to conceal himself, but to collect his forces, and stand dauntless against the misled, to preach and infuse his well-known message : O man, do not prostrate before pseudo-gods, stones, trees, sun or stars; that is a disgrace for humanity —the cream of creation. There is no earthly or unearthly thing worth worshipping except one God, the creator of us all. This was the message that rang not only through the hard and stiff strings of Arabs' hearts, but also resounded at the far ends of Europe across the burning sands and the surging seas.

For the Prophet (peace be on him), Muharram was the advent of acid tests, ordeals and of hard rules against the stony masses of Arabia; nay, it was also the advent of activity and movement in Islam for which the greatest spokesman of humanity sacrificed every item of his interest at his house, and out he went to broadcast his noble mission to the erring human beings of all times and of all climes. This was the Muharram, the month of stubborn resistence and struggle against the Wrong, resulting in the final victory of Islam that rallied round its banners the very self-defeated Arabs and others.

In this month was laid the foundation stone of sacrifice for Islam, by the pious hands of our beloved Prophet (peace be on him). Not only that. But at the altar of our religion, the same foundation was reinforced by the life-sacrifices of those proud heads of Islam that never bent before the Wrong. Under the oppression of the barbarous army of the

Our New Year

The sun had gone down into the bloody pools of the West. The evening was thickening. And the students with their searching eyes were gazing at the sky, for anticipating the pleasure of the New Year's holiday. I also laboured to perceive the New Moon, and there she was with her semi-circular orb and praying hands, appealing to the fashionable Brutes of the West for peace, and at the same time abhorrent to receive the professional tears of the Pyali Shahs of the East.

At the sight of the New Moon, the record of the past year flashed across my eyes. Along with the thoughts of the New Year, I could not forget the Muharram activities. The paid drummers, the professional beaters of breasts, the hired rascals crying hoarse "Hobson Jobson," and the funmakers shedding crocodile tears round the model-tombs of our illustrious Imam Husain (peace be on him), moving through streets and lanes, mustering up all the loafers and vagabonds, with sacred names of the martyrs on their dirty tongues.

Everyday that brings in the New Year is the day of new hopes and cheerful aspirations for every community. But what about Muslims ? Is not Muharram the month of mournings for Mussalmans, according to popular opinion ? Then, should Muslims who assert to have the most scientific religion commence every year with weeping ? Is it not really irreligious, ominous and cursed thing to begin one's New Year with beating of one's breasts? Alas, most of us could understand what Muharram means !

The poet is so much shocked at the sad condition of his countrymen that he breaks into tears and says :

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا   لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

In addition to the subject of the poem Iqbal preaches in this poem the doctrine of universal love :

شرابِ رُوح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی   سکھایا اُس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

At a time when India was being rent assunder by sectarian prejudices, Iqbal acted as a beacon light to raise his countrymen from the deep slough of despondency and inspired them to give their lives for the sake of their mother country. Every shorter or longer nationalistic poem of Iqbal is a source of perennial inspiration to his people for all ages to come. Throughout his life Iqbal was a fearless champion of every cause based on justice and fairplay. He was an ideal man with strong character, self-respect, service of Islam, and love of the motherland not in the narrow sense of modern nationalism. Iqbal was the national poet of India and as such he served his country more than the so-called political leaders who day and night cry "Swarajya, Swarajya," but never wish to have it !

HAR GOBIND SINGH RABBANI.

in which he appealed to the people for unity. Addressing the Brahman Iqbal says :

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں   بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دِل کی بستی   آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے   سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے   دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

Iqbal wanted Indians to come to mutual toleration and co-operation with one another without considering the religious differences, for every religion is a message of peace and of love of humanity. Says Iqbal :

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا   ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

One thing must be noted in this connection that Iqbal never favoured a nation of Indians with one mind in order to have a union between Muslims and Hindus; for the creation of a nation with one mind means the Suppression of the individual culture. "The unity of an Indian nation," says Iqbal, "must be sought not in the negation, but in the mutual harmony and co-operation of the many."

One of Iqbal's masterpieces is his national poem (تصویرِ درد)
The poem is highly pathetic and presents the feelings and sentiments of a true patriot who is deeply concerned with the destiny of his country. The poet says :

رُلاتا ہے ترا نظّارہ اے ہندوستاں مجھ کو   کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنیوالی ہے   تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو   تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

Besides the artistic value of the poem is very great. It marks Iqbal's genius as the greatest nature poet of India.

Iqbal had a great devotion and love for India. The love of his country was the very salt of his life. Says Iqbal :

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہم اگر ہوں رہتا ہے دل وطن میں سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

Iqbal as a poet was interested in life more than any-other poet of the world. Hence his nationalistic poetry, like his Islamic poetry, is of various uses in life. It is constructive and in addition to so many advantages substantial, its value in the development of the mind is too great to be underrated. Iqbal like a true patriot could not ignore the national destiny —, and with this point in view he wrote such inspiring poems as

(پیامِ مشرق) ساقی نامہ، نانک، نیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا گیت، تصویرِ درد، ترانۂ ہندی

etc., etc.

Iqbal believed that the real cause of all the trouble and political weakness of India was the restrained relations of the two major communities of India—Hindus and Muslims. He wanted them to come closer for mutual understanding. And to bring about a union between them he wrote نیا شوالہ

مسلمِ خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو

he did not address a particular section of people, but his message was to mankind in general.

To resume the thread Iqbal was a great lover of his country and a patriot in the true sense of the word. Those who blame him for being an enemy of the country, are not only unjust to Iqbal but to the country as well. Iqbal was a great patriot, but his love for his country had nothing to do with Jingoism. As an Indian Iqbal loved India and worked for it, but he ever remembered that he belonged to the larger family—the humanity.

تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است   کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

Coming to the subject in question, I may say that Iqbal was a great patriot and loved his country best. The woeful tale of the sufferings of the Indian people and the decline of their civilisation and culture ever occupied his mind. He was shocked at the deplorable condition of his countrymen and their slavish attitude towards Europe. Iqbal gave voice to his feelings in his nationalistic poems that rank very high in the literature of the world. The first poem in this connection is 'Ode to the Himalayas' (کوہ ہمالہ) . This poem reflects the poet's love for his country and is in tune with the need of the time and the taste of the people. It is included in Bang-e-Dara and is an index of modern thought. It begins like this :—

The poet says by the tongue of the Sun's ray:

In fact Iqbal was a true patriot and lived like one even up to his last moment. Those who accused him of being an enemy of the country are positively wrong in their estimation of Iqbal. Undoubtedly Iqbal was a Muslim first and a Muslim last, and as such he had a special message to convey to the world of Islam, but it must be borne in mind that it is to the world at large that he speaks through the Muslim society. The fact is that the character and the structure of the universe and its relations with man can best be understood through religion. The social system of the world cannot last at all without religion. Religion is the basis of all society, without which the world will end in chaos.

Iqbal was a great thinker and his knowledge of the realities of life was first hand. He had a strong faith in religion as "a spiritual basis of all life which is eternal and reveals itself in variety and change."

چیست دیں؟ برخاستن از روئے خاک   تا ز خود آگاہ گردد جان پاک

It is this religion which Iqbal preached and "to which as an Indian he gave precedence over country." Islam in the eyes of Iqbal is the only religion "which in its attitude towards the ultimate reality is opposed to the limitations of man which enlarges his claims and holds out the prospect of nothing less than a direct vision of reality. With this faith in Islam Iqbal focussed all his efforts on the revival of Islam and the protection of Muslim society—a religious experience closest to reality. So Iqbal, when he spoke—

Iqbal's National Poetry

Once a non-Muslim professor of the Mysore University remarked, "The Muslims may claim Iqbal a million times as their property, but he belongs to us all. He is not an exclusive property of any religion or class. If they (Muslims) are proud that Iqbal is a member of their religion, it is no less a pride to us that Iqbal is an Indian." This glowing tribute paid to Iqbal by a non-Muslim scholar is not for his services rendered to Islam, but for what he did for the good of his mother country. In the following lines I shall try my best to give the reader a short, but concise, account of Iqbal as the national poet of India.

Although Iqbal is an anti-nationalist in politics yet his love and devotion to the mother country is too great to be underrated. He loves his country best and above all. His zeal for Islamic revival does not lessen his love for India. Even after his return from Europe, when Iqbal devoted himself to the cause of Islam and started preaching:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا　بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

he was still a true patriot and an ardent lover of the land of his birth.

No doubt as a political conception, Iqbal looked upon nationalism as something most dangerous to civilisation and the culture of humanity, particularly to the solidarity of Islam, but he never forgot his duty towards his motherland.

The Ray of Hope (شعاعِ امید) in Zarbe-Kalim clearly expresses this fact :

for collecting funds for the Shaheed Ganj Case. The meeting was held. Some eight or ten prominent men including a certain Nawab Sahib assembled at his bungalow. When Iqbal came out of his private apartment to attend the meeting he was disappointed to see the Nawab Sahib and returned to his room with the remark, "I am sorry to find here people who have had indirectly a hand in bringing down the mosque."

10. On his return from the Round Table Conference Iqbal paid a visit to Bergson. A highly philosophical discussion took place between the two philosophers. At this meeting Iqbal recited the Hadith "لاتسبوا الدھر" (Don't speak ill of Time) Bergson was very much pleased to hear it. Referring to his close contact with the ultimate Truth, Iqbal recited to Bergson the well-known saying of Kh. Muin-ud-Din Chishti "لی مع اللہ وقت لا یسوی فیہ ملک مقرب"

(I have a time with God when even the nearest angels dare not approach.)

11. Two days before his death Iqbal was unable to go through his usual routine. He remarked, "I have sinned against Time."

M. ABDUL AHAD SAJID,
B.A. (Junior).

I have with Him is that of worship. Meeting, what does that mean? If I come to know that God is coming to meet me I will run away, for the simple reason that if the river meets the drop the latter will vanish. I want to preserve my entity as a drop, and do not want to efface myself. While at the same time in maintaining my position as a drop, I want to create in myself the properties of a river." At this the Dervish moved his head approvingly and said, "Wah, Iqbal Baba ! I have found you as I have heard of you. You know the mashrab yourself. You hardly need the prayers of a Dervish."

7. One day a certain disappointed young man came to Iqbal, and complained of his misfortune. Iqbal advised him to keep a stout heart and said, "The only object of human life is action. Every man is, on a small scale, a creator, and to destroy the creative powers in man is a sin. The Prophet came into the world to tell the people—this is good and that is bad. Carry on your struggle without the least thought of success or ill-success."

8. One day some students of a local college visited Iqbal. Islamic equality was the topic of conversation, Iqbal remarked, "This is my advice to you, and you disseminate it among the people. It is the duty of every Muslim that the curse of Caste System should at once be eradicated. Your caste is Islam. Whenever you face the necessity of disclosing your caste, insist on the fact that you are a Muslim—. Again it is the duty of every Muslim whether he is rich or poor to abhor idleness. He should earn his bread no matter how little, with the sweat of his brow."

9. Once a certain honest Muslim consulted Iqbal about holding a meeting of a few prominent men at his residence

property was never made in ancient times, nor was such a demand put forth in the times of the Moghul Kings—the only conclusion is that kings constantly come and go, but nations go on for ever :—

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت   خراج شہر و گنج کان و یم رفت
امم را از شہان پائندہ تر دان   نمی بینی کہ ایران ماند و جم رفت

—If such a view was ever held, it is not lawful in the 20th century." When in connection with the remission of land tax up to ten kanals suggested by Iqbal, Sir Fazal Hussain the then Revenue Minister of the Government said, "It is a sin without relish." Iqbal replied," If you commit this sin without relish, you will at least prove that you have a regard for justice."

5. On April 25th at about 5 p.m. a German literary scholar and a politician, namely, Baron von Keltheim paid a visit to Iqbal. On an enquiry about his health; Iqbal replied, "I am not afraid of death; I am a Muslim, and shall welcome death with a smiling countenance."

6. One day a Dervish paid a visit to Iqbal. Iqbal requested the Dervish to pray for him. The latter asked, "Do you want riches ?" "No," replied Iqbal.

"Do you desire honour and rank in the world then?" "No," replied Iqbal, "that even I have."

"Do you wish then to meet God?" enquired the Dervish. On hearing this a peculiar brightness appeared in the eyes of Iqbal and he said, "To meet God? Dervish! How can I meet Him? I am a man. He is God. The only relation that

tish statesmen as a danger to the British interests in the Near East. The discussion was yet in progress when the Secretary, who was himself a pan-Islamist, approached Iqbal and asked his opinion about the name of the Society, saying, "Are you going to support me Iqbal?" "Certainly," was the reply. Ultimately the members agreed that the society should be named as the pan-Islamist Society and it should have for its aims "the defence of Islam."

3. Once Iqbal was invited in the famous Dumrao Raj Case by the well-known Calcutta lawyer, the late Mr. C. R. Dass, to give his opinion about the correct reading of a disputed word as an expert before the court. Iqbal proceeded to Patna. He received one thousand rupees per day as his fee, and a hundred rupees daily allowance for his clerk. Dr. Abdullah Suhrawardy and many other lawyers were there. Pandit Motilal Nehru was counsel on the other side. Mr. C. R. Das came to welcome Iqbal and requested him to stay there for two months saying : "It is a state affair and by your mere stay you earn a thousand rupees daily. But Iqbal told him that he could not stay any longer as he was fully prepared to give his opinion. So Iqbal appeared before the Court the next day where Mr. C. R. Das and others were conducting the case. He drafted his opinion and then left by the next train for Lahore.

4. As a member of the Punjab Legislative Council Iqbal took a leading part in an historic discussion in connection with the issue whether land belongs to the Government or to the people. He criticised the view that land is the property of the government. He said "—that all land is the property of God—such a claim for the general

"A Few Moments with Iqbal"

Under the caption 'A few moments with Iqbal,' I am not going to give you an account of the life and personality of Iqbal, but on the other hand will here describe a few stories concerning his life that will give a comprehensive idea of the personality of the great son of India, whose memory is a source of inspiration to millions of people scattered over the globe.

1. In his early days at the Government College, Lahore, Iqbal heard a Maulvi Sahib of high learning making a false statement. This caused disturbance in his mind for he could not understand how a man of such a high learning and personality could indulge in a misstatement. As a result he was uneasy, and could not attend to the lectures. After three or four days Prof. Arnold asked him the reason for his uneasiness. Iqbal related the whole incident. "You will come across many such things!" remarked the Professor.

2. During Iqbal's stay in London, there was a society of young Muslims called Anjuman-i-Islam for facilitating all the social and religious activities in a foreign country. Some of the members desired to change the name of the Society into Pan-Islamic Society, but the new name did not find favour with some of the members as it had a political significance. The late Sir Abdullah Suhrawardy insisted on the word "Pan-Islamic" but Mr. Amir Ali and Mr. Arnold opposed it, for in their opinion the new name would cause great misunderstanding about the Society in England as the Pan-Islamic movement was looked upon by the Bri-

He does not confine man to any particular piece of land. He preaches—

Territorial distinctions, according to Iqbal, are the evils of society and a great menace to humanity. The character and general structure of the universe, its relation to man and the conduct befitting his dignity can be best answered through religion. Religion based on the ultimate realities of life, is a binding force which is always responsible for the collective life of the individuals into an organised association —the desired object of life. Islam is the only religion that has got a dynamic character and "in its attitude towards the ultimate reality, it is opposed to the limitations of man; it enlarges his claims and holds out the prospect of nothing less than a direct vision of reality."

Islam forms an ideal society based on the ultimate realities of life. The Unity of God, the Kaba as the centre for the Muslims and the institution of Ijtihad are the characteristic features of Islamic Society, and make it a living force on earth.

Islam to Iqbal presented an ideal society and religion based on the ultimate realities of life. Hence his zeal for the revival of Islamic Society and the creation of a true Islamic state.

This is, in short, Iqbal's view of a Pan-Islamist. He preached the unity of Islamic countries in order to establish the Government of God on the earth and not to set up a dictatorship or an autocratic form of government. Those who blame him for being narrow-minded because he preached Pan-Islamism are unfortunately blind to the 'ultimate realities of life !"

ALTAF HUSSAIN QURESHI,
II Year.

Iqbal's Political Conception of Society

Although Iqbal took little part in active politics, yet he was as great a politician as he was a poet or a philosopher. As a spokesman of his community and a reformer of Muslim society he took, or he had to take part in the politics of his country and of the world.

Iqbal was a pan-Islamist. He spent his whole life in preaching and emphasising the necessity of union among the Muslim countries. No doubt in his youth he was somewhat inspired by the love of the mother country and wrote poems which smacked of the national spirit, but during his short stay in Europe he developed the political vision of a pan-Islamist, which was determined by his anxiety to protect Muslims, their religion, culture, and civilization.

According to Iqbal the dissolution of mankind into so many nations on the territorial basis or racial distinctions was the greatest danger to the world. His political view as a Pan-Islamist was not only to save the Muslim nation from being devoured by the European nations, but also to lend support to Internationalism as a more stable basis of Society.

According to Iqbal the earth belongs to God. He is a firm believer in ض لہ, and holds the notion :—

ہر ملکِ ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

Iqbal is the only poet who is true to his high principle, and no other poet has shown such a great interest in life as he has done. He is a realist and his art is the expression of his personality and the spirit of Islam, and reflects the evolution of the national mind. There are a few other poets in India, who somewhat appear or rather boast to be progressive and creative in their art; but in spite of all this their works are not a force to be reckoned with and their value in the development of the mind and the reconstruction of society is of no account, as they (the artists) have no independent mind and have sacrificed the freedom of soul to the material surroundings and foreign influence. Moreover the works of these poetasters is in no way the expression of their soul and the colour imparted to their verse is not their precious life blood. Read Josh of Malihabad and you will realize that his poetry which in the opinion of the so-called critics of Art, is progressive and creative and tends to create values of life is nothing but a jargon of high sounding words and phrases devoid of the spirit of revolution and progress. Sincerity of thought which is the touchstone of all great poetry is not found in the last degree in the verses of Josh. The following verse from a poem, one of the masterpieces of Josh, is sufficient to convince us of this fact :

مذاقِ بندگیٔ عصرِ نو کی تجھ کو قسم   نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

This is true of all the Indian artists—poets, painters, musicians and sculptors that their art has isolated itself from the general current of life, and so has deteriorated to a very low standard bringing chaos and disintegration in the society.

'SAMAN.'
(Old Boy).

The artist according to Iqbal must have an independent mind and must not sacrifice the freedom of his soul and all his art must be directed towards the preservation of the Self استقرارِ ذات Life is the touchstone of all art. Art, if divorced from life, is dull and insipid. Iqbal says :

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو   جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

Art must not in any way isolate itself from the general current of life. On the other hand it must direct those, whom it influences, to life and power. It must inspire the devotees to live a life of adventure. It must broaden the individual and national outlook beyond its narrow confines.

Now in the light of this principle study the Fine Arts and see whether they fulfil the purpose assigned to them or not. Whether they are life-giving and reflect the evolution of the individual as well as the national mind or not. The answer is 'No.' Our Art deteriorates to a very low standard and represents intellectual pessimism and mental decay. The artists of the present age have divorced their art from life and as such their achievements are dull and insipid. Iqbal refers to such artists when he says in Zarbe-Kalim :

ہے یہ فردوسِ نظر اہلِ ہنر کی تعمیر   فاش ہے چشمِ تماشا پہ نہاں خانۂ ذات
نہ خودی ہے نہ جہانِ سحر و شام کے دَور   زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات
تو ہے میت یہ ہنر تیرے جنازے کا امام   نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات

Study the works of the painters and the poetasters of the modern age and you will be convinced of the fact.

The above quotation explains clearly Iqbal's attitude towards art. Art of all type according to the above quotation must be refreshing and must show the way to life and power. It must convey reality through the medium of words and colour. The artist must look to opportunities of expression and must not sacrifice honesty and dignity of thought. But what has been mentioned above must not make us believe that Iqbal has no sympathy for the external beauty of art and that his works have no artistic value i.e. they are devoid of beauty. The works of Iqbal, on the other hand, are highly artistic in their value and the external beauty of his choicest words and rhymes, appropriate metres and thoughts raise a poetical edifice of rare beauty and structure. Iqbal is a great master and uses his pen like a master painter's brush, displaying charming colours—that is the point of his greatness as a creative artist. The following verses from Bale Jibreel clearly indicate this :

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن — مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں یا قاف کی پریاں قطار اندر قطار — اُودے اُودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
حسنِ بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لئے — ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی — تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں — تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

Although Iqbal is a popular master of style, yet it is his life-blood that gives colour to his art. He says :

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل — خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر — نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

man and has a more compelling power, a greater urge than what mere animal energy can impart. Similarly art, which is the expression of the soul of the artist does not confine itself to the objective representation of life and nature, but, on the contrary, creates values higher than those already existing. Says Iqbal.

سخن از بود و نابود جہاں با من چہ میگوئی
من ایں دانم کہ من ہستم ندانم ایں چہ نیرنگ است
غزل گو آں کہ فطرت ساز خود را پردہ بردارد
چہ آید زاں غزلخوانی کہ با فطرت ہم آہنگ است

It is mainly for this reason that Iqbal condemns those who hold the notion 'art for art's sake.' According to Iqbal the artist must not merely keep pace with the growing complications and needs of life, but also must have a compelling power to urge humanity to proceed on and to create higher values. In short Art must preserve the Self. Says Iqbal :

"The ultimate end of all human activity is Life—glorious, powerful, exhuberant. All human art must be subordinated to this final purpose and the value of everything must be determined in reference to its life yielding capacity. The highest art is that which awakens our dormant willforce and nerves us to face the trials of life manfully. All that brings drowsiness and makes us shut our eyes to Reality around, on the mastery of which alone life depends is a message of decay and death. There should be no opium-eating in Art. The dogma of Art for the sake of Art is a clever invention of decadence to cheat us out of life and power."

No doubt the chief function of art is to please, but it is more important that in the rendering of human integrity, it must not be a mere representation of life and nature but also must be a representation of the Personality—the Ego of the artist. Says Iqbal :

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے   آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

According to Iqbal the office of the artist is not merely the disclosure of what already exist in Nature, but what it ought to be. He not only reveals the beauty already existing in Nature but he creates it out of the raw material, which Nature places at his disposal, by transforming the commonplace, the ugly and the disordered into the extraordinary, the beautiful and the unified. All the products of art are created by the artist out of chaos into Cosmos and bear the impression of the personality and the individuality of the artist. The artist moulds Nature according to his mind and vision but does not adapt himself according to Nature. He is free of his surroundings and the vicissitudes of life. He with the help of imagination and intuition puts his personality into his achievements. The objects of art are nothing else but the artist himself. Says Iqbal :

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور مے   اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے
جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا   سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

The Ego in man has a state of tension. The consciousness of self, (as we all experience, when we have freed ourselves of our material surroundings and are perfectly conscious of our greatness and divine origin) is a vital thing —moral vital than the hot blood running into the veins of

سینهٔ شاعر تجلی زارِ حسن ۔ خیزد از سینائے او انوارِ حسن
خضر در ظلماتِ او آبِ حیات زنده‌تر از آبِ چشمش کائنات
از فریبِ او خود افزا زندگی خود حساب و ناشکیبا زندگی
اہلِ عالم را صلا بر خوان کند آتشِ خود را چو باد ارزاں کند

As such the artist must have a very high sense of moral responsibility. He must develop in himself a sense of proportion, a higher sense of values. He must try to make himself and those who come into contact with him, independent of the material surroundings—i.e., he must free himself and his soul and must keep his mind and vision unclouded by vicissitudes. His art must be subservient to the higher needs of human life. Since life is the Ego's struggle for self-expression, art must not therefore isolate itself from the general current of life into some enchanted regions of its own; but, on the other hand, it must coincide with man's creative and original activity and help him in his struggle for existence in the Universe. Art, if it does not intend to create higher values in human life, is disapproved of by Iqbal as anything. He says :

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وُہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وُہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

artist transforms the changing, the various, the disordered into the permanent, the unified and the coherent with the help of the power of his imagination. Various artists working on the same piece of nature achieve different results. It is because art is the expression of human nature.

There is a definition in English popular with almost every critic of art that all art has a mimetic or imitative character. It means that the artist does not merely make something beautiful, but represents reality or objects that our five senses consider to be real. Hence all art what it may be—representational art or abstract art,—is the imitation of something, even if it be an idea in the mind of the artist. Mimesis can be applied to every form of art.

By the term 'imitation' we do not mean the photographic representation of life and nature as perceived by the common eye. On the other hand it means a technique for the communication of an imaginative inspiration, which the artist experiences in perceiving and contemplating any aspect of life and nature. If the artist represents this imaginative reconstruction of life in a highly attractive manner without any ulterior motive, he is said to have produced a work of art.

Now I turn to my subject—"Iqbal's conception of Fine Arts."

Iqbal gives a very important position to the artist in society. According to him the artist is the formulator of the destiny of man, the maker of his fortune, and the builder of his character. This is cent per cent true in both the cases—whether of an individual or of a nation. Says Iqbal in 'Israr' :

Iqbal's Conception of the Fine Arts

Before I explain what Iqbal thinks of the fine arts, or what his conception of the fine arts is, I may in a few lines give what the general opinion about art is. Art, whatever may be said of it, is on all hands admitted as being the most significant and comprehensive play of the human mind on Nature. Every branch of art, may it be poetry or music or anything else is Nature perceived through a particular temperament, facts seen through a particular mind.

The artist is first and foremost a maker. Out of some material he fashions a form which does not stand merely for the object in question, but also for whatever the artist takes to be its essential characteristics, or, in other words, the form made by the artist is his critical conception of the object. An artist has always in his own mind a form more tangible and distinct than the one he sees with his physical eyes. He compares the measured thing before him with the half-created form in his mind and then feels incited to fashion out a form—an object of art. For the artist the fact is nothing, unless it is transformed by intuition and perception into the object of perception. The artist puts an idea and intuition into the representation. True it is that he creates something less than the reality which he aims to reproduce, but truer it is that he gives more than what is truly speaking the object in question. By stamping the best of material he uses with the cast of a Form and an Idea, the

and their struggle to have a free Islam in a free world is the outcome of the teachings of Iqbal.

Iqbal has revolutionised life almost in every walk. He has brought about a revolution in our political life, a revolution in our social life, and a revolution in our religious life The present political and social movements in the Muslim world and the revolution in thought and letters bears testimony to this. The influence of Iqbalism is permanent. It is world-wide and bids fair to have a lasting impress on the destiny of the world. The teachings of Iqbal are nothing but an echo "of a Prophet's cry," Semitic to the core, yet of a meaning so universal and so timely that all the voices of the different ages take it, and it echoes over palaces and deserts, over cities and Empires, first kindling its chosen hearts to world conquest, then gathering itself up into a reconstructive force that all the creative light of Greece and Asia might penetrate the heavy gloom of Christian Europe, when Christianity was but the Queen of the Night. The Christian Europe is again on the same level though not as the Queen of the Night, yet blind and mad in its pursuit after materialism which is engendering chaos and bringing about the complete destruction of the universe. But to the good luck of humanity the old cry which once gave life to the dead Europe is again echoing in every part of the world with a new impetus and vigour in it and let us hope that it will purge Europe and along with it the world of all the evils that materialism has introduced into it.

اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی   دلیل صبح تاباں ہے ستاروں کی تنک تابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا   سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے   شکوۂ ترکمانی۔ ذہنِ ہندی۔ نطقِ اعرابی

ALI MOHD. DAHIR,
B.A. Student,
Editor, "Nakhlistan-i-Adab."

ascetism, on one hand, and materialism, on the other. Being a Revolutionist, he determined not to adapt himself to the world, but to mould the world according to his heart's desire. He says:—

حدیثِ بے خبراں است با زمانہ بساز — زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

His message is that of جہاد and خودی To follow or to be under the yoke of some one else than one's own self, is the greatest crime with Iqbal. He says :—

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب — پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے
تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است
تا کجا در تہ بالِ دگراں مے باشی — در ہوائے چمن آزاد پریدن آموز

"Goodness is not a matter of compulsion, it is the self's free surrender to the moral ideal and arises out of a willing co-operation of free egos. A being whose movements are wholly determined cannot produce goodness. Freedom is thus to be a condition of goodness."—Iqbal.

It is for this reason that Iqbal preached :—

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

Preaching in this way Iqbal made the dead bones of his nation instinct with life. His revolutionary ideas stirred the soul of his people, awakened lofty feelings in them; and set them on the golden path of progress. We shall see, if we study carefully, that the present awakening among the Muslims

That is the true revolution. And a true revolutionist is he who does all this. A revolutionist accepts truth, not because it has the sanction of social tradition and religion at its back, but because it is truth. He cannot tolerate what is wrong and unjust, and so revolts against it. The life of Iqbal is a never-failing corroboration of this truth.

The time when Iqbal came into this world was the most critical time in the history of his nation. The Muslim world was facing a crisis in the shape of the aggression of European powers combined with the severe attacks of materialism. It was surrounded by deadly foes on all sides. The European powers were seeking opportunities to pounce upon the Muslim world and their civilization and even destroying Muslim culture and civilization and everything else that was Muslim in spirit. The entire Muslim nation had lasped into slumber, and there seemed little signs of life in it. The Philosophy of Aflatun and the medieval Sufism and contact with other classes (in India) had made Muslims strangers to action, and had brought about a degradation by turning the tiger into sheep. Muslims had become fatalistic and pessimistic in their outlook on life. This infused in them a spirit of asceticism and self-annihilation, and brought about a complete ship-wreck of the vessal of humanity. The Muslim nation weakened by the aggression of the forces of evil from without and within was breathing her last, when the Revolutionary Iqbal came as a Messiah and stirred the nearly dead nation into life. Inspired with the best ideals of جہاد and خودی he took up the cudgels against all the reactionary forces that were trying to uproot the tree of Islam. He denounced the pseudo-Sufism which is another name for

Iqbal the Revolutionist

Sir Mohammad Iqbal is a poet-philosopher. He is ranked as one of the greatest literary geniuses of the world. As a philosopher he is perhaps greater than even Aflatun and Arustu. But more than this, he is a great and successful revolutionary. Great as a poet, great as a philosopher, Iqbal is still greater as a revolutionary. His spirit was full of fire and revolution. In every walk of life, we find him rising against everything that smacks of injustice. He stands in revolt against everybody and everything that puts any hinderance in his way. The spirit of revolt was ingrained in his very nature. Iqbal without the fire of revolution is no better than Hafiz, Ghalib, or Shakespeare. His sole and supreme credit lies in creating and leading a revolution which is bringing about a true reformation in the political, social, and economic life of the Muslims in India. We are just going to view him as a veritable ball of revolutionary fire that gave light to the dying-down nation,—that burnt to ashes all the accumulated ills,—social, religious and political, which were eating into the vitals of Muslims all over the world. We shall not enter into a detailed discussion of Iqbal's life and activities, but shall have just a peep into the revolutionary aspects of his life.

When a nation lags behind in marching with the pace and progress of time, when the creative genius of a nation is stunted, when the life of a nation is on its last stage, then, by the Grace of God revolution comes with a message of life, and shapes and creates things as they ought to be.

maintained, it tends to make man immortal. There are certain modes of thought and action which help man to maintain the state of tension. The Ego has to overcome Nature which is the greatest obstacle in his way to God.

Being an oriental, Iqbal believes in the efficacy of love. To add the fuel of love to the fire of intellect helps the Ego to preserve and enlarge itself. The Ego, according to Iqbal is fortified by love. But what does he mean by love ? Love, says Iqbal, is the desire to assimilate, to absorb. Its highest form is the creation of values and ideals and the effort to realise them. While Love enlarges the Ego, inaction weakens it. Love is the guiding principle of all activity in the universe and hence it tends to fortify the Ego. By cultivating love and overcoming matter, the Ego attains full freedom and becomes complete. To be lost in the Supreme Being, like an arrow completely penetrating its target, is not the goal of mankind. Man cannot be absorbed in God but absorbs Him into his Ego. The completest Ego is the final stage of man's development and it survives at all costs. This is in a few words Iqbal's philosophy of life.

MOHD. SALEH RAHMANI,
Cadet. (Old Boy).

Iqbal's Philosophy of Life

Of all the resplendent stars that bespangle the literary and philosophic firmament of the world none durst stand equal to Iqbal in his abounding effulgence and overwhelming radiance. He is one of the greatest poet-philosophers of the world and his influence on contemporary life is greater than that of anyother. His works have profoundly stirred the soul of the people of the world particularly of the Muslims in India and abroad. He has, through his teachings, awakened lofty feelings, and aroused pride in his people and set them on the path of action and progress.

Iqbal is the bearer of a new idea, illuminating life with a fresh significance.

All life, according to Iqbal, is individual. There is no such thing as universal life,—even God is an individual. This universe, defines Iqbal, is nothing but an association of individuals. The final aim of man, according to him, is the viceregency of God on earth. His ideal is not self-negation. He is opposed to man's absorption in a universal life. Man, says Iqbal, is individual, but an incomplete one. But by creating in himself the attributes of the most unique individual he attains more and more perfection, thereby approaching God. The nearer he is to God, the greater is his individuality.

In man, according to Iqbal, the centre of all life becomes an Ego or Person. Personality is a state of tension and can continue only if it is maintained. If the state of tension is

tyrant and ignorant, will himself, as a being, seek the company and co-operation of the lost Particle of His Divine Soul. Says Iqbal.

یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی — ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے — کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے
عبد و مولا در کمینِ یک دگر — ہر دو بے تاب اند از ذوقِ نظر
زندگی ہر جا کہ باشد جستجوست — حل نشد ایں نکتہ من صیدم کہ اوست

To discuss what these divine laws are and 'how they save the ego from reverting to relaxation' is simply impossible in this short essay. I shall by the grace of God, write on this topic in the next issue of the magazine. But those who are not patient to wait till the next issue, should carefully study my essay اقبال اور خودی in the Urdu Section. For the present I confine myself to a few verses from Iqbal, which will give you Iqbal's view on Life, the evolution of the Soul and Taqdeer.

تو کہ از نورِ خودی تابندۂ — گر خودی محکم کنی پایندۂ
چوں خبر دارم ز سازِ زندگی — با تو گویم چیست رازِ زندگی
زندگی از طوفِ دیگر رستن است — خویش را بیت الحرم دانستن است
اے کہ گوئی محملِ جان است تن — سرِّ جاں را در نگر بر تن متن
چیست جاں؟ جذب و سرور و سوز و درد — ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد
زندہ مشتاق شو خلاق شو — ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو
در شکن آں را کہ ناید سازگار — از ضمیرِ خود دگر عالم بیار
ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست — پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست
مردِ حق برندہ چوں شمشیر باش — خود جہانِ خویش را تقدیر باش

MOHD. NAWAZ SHAHEED,
B.A. (Final).

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش   براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید   گناہے ہم اگر باشد ثواب است
گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد   گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن
حدیثِ بے خبراں است با زمانہ بساز   زمانہ با تو نسازد تو بہ زمانہ ستیز
آتشے افروز از خاشاکِ خویش   شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش
خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے   ذرّہ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر
زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود   ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

If man is to be deprived of this free and creative action, he will be nothing better than the inanimate things such as trees, stone, etc., etc. Man must not follow the theory of a pre-ordained destiny; he must not believe in Fatalistic resignation, but, on the other hand, must create his own and everything else's destiny. This is in a few words what Iqbal preaches.

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر   ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات   مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

You may ask what these laws of God احکام الٰہی mean ? Are not they pre-arranged plans of God ? and restriction on our free action ? No ! the laws of God are not anything like a pre-arranged fate and put no check on the free will of man. On the other hand, there are certain laws which, if observed, help the ego in maintaining the state of tension. By observing these laws man can attain such spiritual heights that the Lord, who once called him

Man, says Iqbal, is the flower of creation, and as such is the master of his soul and the formulater of his action. He has a free will to do and not to do a certain task. He can do and undo what he likes. He is a co-creator with God in some respects. To talk of such a being as a slave to the pre-ordained fate is simply to shut one's eyes to the facts of life. A psychological survey of the human mind clearly shows that man has got a free will and can act boldly in any way unchecked by any power from without. Life is action and not contemplation and the activity in life, if it is original and creative, is the most valuable gift of man, through which he creates a world filled with the highest order and beauty.

دم بدم مشکل گر و آسان گذار　　دم بدم نو آفرین و تازه کار
خلعتے از آب و گل پیدا کند　　دست و پا و چشم و دل پیدا کند

Iqbal prefers a life of activity to that of stagnation and slothful ease. To him an hour of crowded glory is worth a lifetime without a name. He says :

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟　　یک دم شیری به از صد سال میش

Iqbal assigns a very important position to the free and creative action of man; for :

Life is man's secret, the Essence of his creation;
Fetter it—it shrinks to an indigent stream;
Free it—it becomes as the limitless ocean;
Though hidden in a house of clay
Life shines forth in the will to conquer.

(Iqbal).

According to Iqbal activity on the part of man must be creative and original and must not run into routine patterns. Creative action is the mission of man's existence on the earth. Says Iqbal :

Believing that the Omnipotence of God is in no way a check upon man's free will, Iqbal gives a most logical and convincing answer to the problem of Fate or Destiny. He says in Javednama :

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر   خواہ از حق حکم تقدیر دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست   زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست
ارضیاں نقدِ خودی در باختند   نقطۂ تقدیر را نشناختند
رمز باریکش بحرفے مضمر است   تو اگر دیگر شوی او دیگر است

شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست
قلزمی؟ پایندگی تقدیرِ تست

These few lines epitomise Iqbal's view on Destiny. He believes that Destiny is nothing but what we are or what we do. We, and none else, are the formulators of our destiny and the makers of our fortune. This tall talk of Destiny as a pre-arranged plan is merely a mask for hiding the reactionary and retrogressive tendencies of the weaker souls. This fact is brought out in مکالمہ مابین خدا و ابلیس in Zarbe-Kaleem.

ابلیس   اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر   آہ وہ زندانیِ نزدیک و دور و دیر و زود
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا   ہاں مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

خدا   پستیٔ فطرت نے یہ حجت سکھائی ہے اسے   کہتا ہے تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام   ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

To hold the opinion that a superimposed fate moulds man's life is as absurd as anything. It is because man is co-eternal with God and the master of the Universe which lies helpless before him to mould and conquer.

We have mentioned somewhere above that the will of the ego is part of the will of God, and therefore, does not in any way detract from His Omnipotence. There is every possibility of the combination of the resignation to the will of God— (توکل) , and the free action of man. The life of the Holy Prophet (may peace be upon him) bears testimony to it. The Holy Prophet no doubt preached that we should resign to the will of God, but nevertheless he warned us against the fatalistic or pure resignation which leads to the negligenle of one's efforts to control the situation. In the words of Iqbal, the Prophet said to the Arab, who said that he had left the camel to the care of God and His Prophet, when he was asked what he had done to the camel before coming in to see him (the Prophet).

گفت پیغمبر بآواز بلند   بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

Resignation to the will of God and desire for bold action are the main principles of Islam and are not averse to each other. Hence a combination is possible or rather certain between them. Says the Holy Quran الحرکة فی البرکة.

Iqbal's faith in the supreme greatness of man is so strong that he does not hesitate even to say :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے   خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

apparent that man's destiny is not pre-ordained, but it is he who moulds it in the way he likes best. The free will of the ego is part of the free will of God, and consequently does not in anyway go against the Omnipotence or the Omn'scense of God. Says Iqbal :—

بینی جہاں را خود را نہ بینی   تا چند ناداں غافل نشینی
نورِ قدیمی شب را بر افروز   دستِ کلیمی در آستینی
بیروں قدم نہ از دورِ آفاق   تو پیش ازینی تو بیش ازینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید   مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند ہرگز نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

The words of God "Good and evil are for the person who does them," imply that there are ample chances for independent action on the part of man. Man is perfectly and assuredly the master of his destiny; and all that exists in the Universe is inferior to him and consequently is under his supremacy. Man, preaches Iqbal, is a mighty flame of fire, capable of singing the lowest depths of the nether world and the loftiest heights of the empyrean. This idea is fully expressed in the following lines :—

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد   حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل   حذر اے پردگیان پردہ درے پیدا شُد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور   خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شُد

everything else. The famous poem کالمہ مابین خدا و انسان is a positive proof of this. The poem runs like this :—

خدا
جہاں را ز یک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان
تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و راغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از بادہ نوشینہ سازم

These few lines epitomise the views of Iqbal on man, the Co-creator with God and the formulator of his own destiny and that of everything else destiny.

But what is Destiny. Iqbal defines—'It is time regarded as an organic whole that the Quran describes as Taqdir or Destiny a word which has been so much misunderstood both in and outside the world of Islam. Destiny is time regarded as prior to the disclosure of its possibilities. It is time freed from the net of casual sequence—Time regarded as destiny forms the very essence of things. As the Quran says 'God created all things and assigned to each its destiny.' The destiny of a thing then is not an unrelenting Fate working like a task master; it is the inward reach of a thing; its realizable possibilities which lie within the depths of its nature." From the above quotation it is

The pessimists relegate man to a very unimportant position in the system of the Universe. Man according to them is not the master of his will and the formulator of his destiny; but, on the other hand, he is like a helpless reed tossed about by the furious waves of Fate. He is nothing but a mere toy in the hands of destiny, incapable of doing anything according to his own will. A pessimist says:—

چنیں شدم چہ شد یا چناں شدیم چہ شد   زمیں شدیم چہ شد آسماں شدیم چہ شد

Such kind of Passive Fatalism and yielding to a calamity rather than facing it, is the result of a diseased will and stifles all human activity. Iqbal is a reaction against all these paralysing forces of Fatalism which cheats mankind out of life. He is a messenger of life—the life of action; his idea of the development of Khudi (خودی) or personality is a crusade against the blind Destiny or the Passive Fatalism. He preaches action and initiative. Complete resignation to the pre-ordained Fate and the negation of one's own Self is the greatest crime in his eyes. Says Iqbal:—

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو   منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

Man, according to Iqbal, is the Deputy of God on the Earth, and as such he has to fulfil the Divine purpose underlying the creation of the Universe. With this faith in the supreme greatness of man Iqbal cannot but eliminate Fate in the sense of the tyrannical ordinance of the Universe. On the other hand Iqbal says that man is the master of the Universe, and is the maker of his own destiny and that of

which is of course the best of its type and most truly represents the pessimistic outlook of life.

شمعِ سحر کے دل سے پوچھ حسرتِ محفلِ حیات　　نیزۂ غم سے چاک ہے سینۂ ساحلِ حیات
آہ یہ بے کسی تری رہروِ منزلِ حیات　　توڑ گئی قدم ترے قیدِ سلاسلِ حیات
ہے ابھی راہ میں لگی ظلمتِ شامِ زندگی

عشرتِ رنگ و بُو کہاں گلکدۂ شباب میں　　موجۂ آب جُو کہاں چشمۂ آفتاب میں
مستِ تصورِ نشاط گم ہو کہاں کے خواب میں　　جامِ ہوس کو دُور پھینک زہر ہے اس شراب میں
سلسلۂ الم کو توڑ دامنِ زندگی کو چھوڑ

گوشۂ خامشی میں بھی غم سے نہ مل سکی نجات　　عرصۂ زندگی رہا موردِ صد حوادثات
دفترِ رنج و یاس ہے شرحِ کتابِ کائنات　　موت کی نیند کے سوا کیا ہے تلافیٔ حیات
قیدِ الم ہے زندگی دوزخِ غم ہے زندگی

صُبح ہے صُبحِ نامراد شام ہے شامِ غم فروز　　روز ہے روزِ حشر خیز شب ہے شبِ الم فروز
طرزِ فلک جفا طراز دورِ زمیں ستم فروز　　دشمنِ خواہشات ہے زندگیٔ عدم فروز
آہ! اسیرِ زندگی زخمیٔ تیرِ زندگی

شاکیٔ بادِ غم رہی شمعِ حریمِ آرزو　　محرمِ تیرگی رہی چشمِ کلیمِ آرزو
قلب میں تیر نارسا نشترِ بیمِ آرزو　　رُوح سے دُور ہی رہی موجِ نسیمِ آرزو
بابِ اثر نہ مل سکا غنچۂ دل نہ کھل سکا

نوکِ سنانِ یاس سے زخمِ ہوس سیا تو کیا　　تلخیٔ صبر کا پہاڑ سر پہ اُٹھا لیا تو کیا
رُوح کی خواہشات پہ جبر اگر کیا تو کیا　　دوزخِ غم خرید کر آہ! کوئی جیا تو کیا
سلسلۂ الم کو توڑ دامنِ زندگی کو چھوڑ
آہ! اسیرِ زندگی زخمیٔ تیرِ زندگی　　(روشن صدیقی)

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے اے ہے نہیں ہے

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

The follwoing verses from Ahmad Nadeem Qasmi, also indicate the same helpless state of puzzledness in which Khayyam and Ghalib are caught:—

اتنی نیچی وادیاں اور اتنی اونچی چوٹیاں
اس بلندی اور پستی سے ہے کیا مقصد ترا

مضحکہ انگیز ہے یہ امتیازِ خوب و زشت
کیا یہ دھوکا ہے مری نظروں کا اے میرے خدا

آسماں چپ تھا ہوا ساکن زمیں خاموش تھی
ایک ویراں راستے پر جا رہا تھا اک جواں

میں نے پوچھا اے مسافر کس طرف جائیگا تو
کانپتی آواز میں بولا "مری منزل کہاں"

اے مرے مدت کے بچھڑے دوستو اس دہر میں
جز غبارِ راہِ منزل اور کچھ حاصل نہیں

These verses are the outcome of the poet's heart, pensive and full of deep pathos. But the pensive malancholy in which the poet breaks out, although very human in its tenderness and extreme sensitiveness to the burden of human sorrow, is yet very unprophet-like and degenerating. To have a clearer and more concrete knowledge of the Fatalist destiny one should read the following poem,

with the exception of the excellent Rumi (may God have mercy on his soul) who says:—

Rumi assigns to man a special importance in the system of the universe, an importance which exceeds that of the earth and the heavenly bodies. With this faith in the greatness of man, he is never pessimistic. Helplessness, melancholy, and despondency, which are the key notes of the eastern poet's attitude towards life and destiny are meaningless and obscure to Rumi. His is, on the other hand, an attitude of confidence and assurance of man's supreme greatness over the entire universe.

To resume the thread of our discussion the fatalistic resignation is the outcome of mystical philosophy and Platonic contemplation and has led to the denial and negation of life.

The third poet of considerable importance in this connection is the famous Urdu poet Ghalib, who, although he has no consistant philosophy of fate, is yet deeper in pathos and more reflective and philosophic in his attitude towards Fate. Feeling puzzled before the contradiction and improvidence of life, he tries to determine the cause, but reacts to it in the form of bohemianism. Ghalib like Omar Khayyam is lost in his puzzledness and has no faith in the ultimate success and greatness of man's life, and relegates man to a very unimportant position in the cosmos. The following verses clearly indicate Ghalib's attitude towards life and destiny. He says :—

Groaning under this sorry scheme of things, Khayyam tries to conspire against and upset Fate and to remould it nearer to his heart's desire. But finding no escape his reaction turns into the drinking of wine and more wine—supreme and everlasting oblivion.

ساقی قدحی که شمع دل در نگرفت   تا ز آتش می زندگی از سر گرفت

ماییم خریدار می کهنه و نو   وانگاه فروشندهٔ عالم بدو جو
پرسی که پس از مرگ کجا خواهی رفت   می پیش من آر و هر کجا خواهی رو

Wine is for Omar what oil is for the lamp—it is his very existence as he says :—

ساقی قدحی که سوز داغم نرود   تا روغن باده در چراغم نرود
بوئی که چون غنچه در دماغم ز می است   مغزم بشگافی از دماغم نرود

After Omar we come to Hafiz, the greatest lyrical poet of Persian, whose sweetest songs are not those of the attainment of his heart's desire, but rather of the sorrows of disappointment and failure. Hafiz; very like Omar, believes in Passive Fatalism. According to him man has no free will of his own, and his actions are wholly determined by some power other than man himself. Fate or Destiny is a pre-ordained plan. Man has no hand in formulating his destiny. Hence a complete resignation to the will of God is necessary. Says Hafiz:—

رضا بداده بده وز جبین گره بگشا   که بر من و تو در اختیار نگشاده است

This Passive Fatalism or Fatalistic resignation to the will of God is the burden of the poetry of all the Eastern poets

Destiny—in Iqbal

The theme of Destiny or Fate can be handled in various ways. It is as old as human sorrow and as deep as tragedy, but in the common run of our poetry its treatment has not gone beyond the expression of sorrow at failure and disappointment, and the conception of a mythical being, the sky or the stars appearing as the incarnate Fate. The first poet of note in this connection is Omar Khayyam in whose quatrains, we find an attitude of sullen indifference to a tyrannical and bungling Providence. Khayyam was always in the fatal grip of pessimism and melancholy which engendered in him a spirit of the denial of life. He says:—

هرچند که رنگ و بوے زیباست مرا   چوں لاله رخے چو سرو بالاست مرا
معلوم نشد که در طرب خانهٔ خاک   نقاش من از بهر چه آراست مرا

Omar caught in this helpless state of perplexity is always groaning. He is bewildered and completely overcome by the chaos and darkness of the world, and losing sight of his own greatness and divine origin is terrified by the spectacle of the apparently stupendous difficulties and troubles facing him. He accuses his destiny which he believes is a pre-arranged thing and lies beyond his reach somewhere in the spheres of the stars and the depths of the blue sky. Says Omar:—

ما لعبتگانیم و فلک لعبت باز   از روئے حقیقتی و نه از روئے مجاز
بازیچه همی کنیم بر نطع وجود   رفتیم بصندوق عدم یک یک باز

pray there may be many among those whom I see before me to-day who will come to the top. To those who do not I would repeat what I have already said that if each one of us does his best to fill the particular niches which fall to his lot he is as useful and as necessary for the good of the society as a whole as the few who occupy high pedestals. They may find consolation in the beautiful lines of a Persian Quatrain, probably by Omar Khayam, which says:—

آنکس کہ بدہر نیم نانِ دارد   وز بہر نشست آشیانِ دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے   گو شاد بزی کو خوش جہانِ دارد

"Whoever has got in this world half a loaf of bread and a nest to shelter him, who is neither the servitor of anyone nor served by anybody. Tell him to live merrily, as this is a life of bliss."

said about the growth of industrialism in the State and the part which its educated young men may play in it. In Indian States, you have one advantage which we in other parts of India do not possess to the same extent. While we are gradually advancing towards "Swaraj," the Indian States enjoy it in many respects. Given a sympathetic Ruler and a progressive administration you have great latitude for trying beneficent experiments of a constructive nature if you think them worth while. You are not bound by hard and fast rules, and even if you are, by rules of your own making which you find irksome, your government have facilities for modifying them to suit your newly arising needs. There is no reason therefore, why you should not take advantage of such facilities you have, and should not help your young men in finding useful occupations in life beyond employment in the offices of the State.

I hope what I have said as to finding of new means of livelihood among hitherto less coveted avenues of work would not be taken to mean that I wish to discourage young men from taking to the learned professions or literary pursuits, for which they have qualified after years of hard work. I recognise that those are the more natural outlets for their energy and must continue to attract the most talented among them. You know the well-known saying that there is always room at the top. It is as true to-day as it was, when it was first uttered by some one. I will, however, modify it a little and say that these walks of life have become so crowded now that there is room only at the top for those who have the patience and the grit to work their way up in the midst of discouragements and difficulties. I

should be resourceful enough to devise ways of living for themselves, even though their beginnings are humble and give them a bare subsistence. If they do this, we may see in course of time that from them big masters of industries and builders of fortunes may spring up.

You are familiar with the saying that he who helps to grow two blades of grass where there was only one before is a benefactor of humanity. Now see what a prospect of work opens up before you, provided some of you can turn your hand to the plough. The Government of His Highness the Ruler Bahadur of this State, in co-operation with the Punjab Government has harnessed the waters of the river Sutluj to the service of the vast uncultivated areas in the State and are making a thousand blades of grass grow where there was none before. Do not you think that it is your duty as the citizens of the State and as able-bodied young men, with sinewy hands and arms, to take a share in developing the areas won back from the sandy desert, by your Ruler and his administration. I once suggested to the Punjab Government that in order to relieve unemployment among the educated class, free grants of land or grants on easy terms may be given to graduates or under-graduates who may be willing to cultivate land with their own hands. I was told that Government would willingly do so, if it felt sure that educated men would be prepared to work, but that it was doubtful that they would take to manual labour of this kind. I understand the experiment has been tried on a modest scale in the Punjab. A similar experiment, if tried in the State, where young men are less sophisticated, may perhaps prove more successful. The same may be

will keep you busy and keeping one's self busy is one of the secrets of a happy life. Besides this it may lead to some paying work being created for you in your own village or town when people see your zeal for work and selfless devotion to the good of your fellowmen. Some of you who may have a brain for business should turn your thoughts at once to finding a business that will suit you. If it brings you just enough to live on, you should consider that small income as of higher value than service in any Government department as it gives you independence. Those of you who can turn your hand to some kind of manual labour should not hesitate to do so. The idea that has long clung to the minds of educated men in our country that manual work is below the dignity of the lettered people is a wrong idea and should be got rid of. The Holy Prophet of Arabia has left a noble tradition behind him, which says

الکاسب حبیب اللہ

"The man who earns his living by his handicraft is loved by God." He himself acted upon this maxim. He mended his own shoes, his own sacred hands were used in the building of his mosque in Medina, the home of his adoptation after he left Mecca. The late Maulana Hali, our national poet, emphasised the nobility of work in the following forceful words:—

کمال کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے   یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

"Excellence in shoe making is more useful than the knowledge of Plato. This is a subtle truth which has not been understood by philosophers of old, known as Mashais and Ishraqis."

In drawing attention to this aspect of the question what I wish really to emphasise is that educated young men

anything to help themselves if they do not succeed in finding employment in Government offices.

The best advice that I can give to my young friends is Be Brave." In the conditions prevailing now a few lucky ones among you may find work in certain departments of the State and begin to earn their living, but for the majority of you there is nothing but struggle. The words "battle of life" were previously used in the metaphorical sense. They are now true in fact. Life is a veritable battle in which you have to fight with a determination to win. Look at young men of your age in Britain, in Canada, in Australia, in New-zealand, and a good many Indians doing military duties to-day. They are going out bravely in response to the call of duty, prepared to lay down their lives in the grim fight before them or to come out victorious. Apart from the risks of war there is nc end of hardships that the soldiers have to endure. To live in the trenches in cold and wet weather, to get limited rations of food and to deny themselves all comforts of life, are only some of their sufferings. The struggle before you in your hunt for careers is nothing compared to what your peers are passing through, but it calls for the same heroic spirit, the same determination, and the same capacity to bear hardships and to suffer defeats in the hope of gaining victory in the end. I would give one practical suggestion to be tried by you while you are trying to find jobs and learning to "struggle and to wait" and that is this that you should start doing something useful even if that activity does not bring you any money. For instance, when you go back to your village home you may start a campaign against illiteracy or devote your energies to the improvement of the sanitary conditions of your surroundings. This

education that the cultivation of physical powers is as necessary as mental progress. The Principal of this College has been a well-known sportsman of the Punjab University. I am told he is called the "Father of Games in Bahawalpur State." It is not surprising, therefore, that the young men under his influence are fond of sports. It appears that in the year under report the College could not achieve success in the finals of the games in which it competed with outside teams, but from the promising starts made by the various College teams, it may be hoped that with perseverance it will be able to hold its own against its rival teams in the Punjab in the field of sports, as it already does in the average of the results of the University Examinations.

It must be remembered, however, that examination results, though important, are not the best test of the efficiency or usefulness of a College. The real test is whether you have succeeded in making men out of the boys that were entrusted to your care at the most pliable time of their life. The application of this test is now more than ever necessary. It is no longer enough to say to the out-going young men, "we congratulate you and give you a hearty send-off and our good wishes to every one of you for a successful career." We cannot continue to live in an imaginary dreamland as to the prospects of those who have taken their degrees but, must face facts as they are. There was a time when a young man with a University degree had a fairly good chance of finding employment, but now at the end of their academic careers our students have to be prepared for more disappointments than appointments. The situation thus created raises the important question whether young men can do

moment is the proposed introduction of military training in the College. The world is unfortunately passing through a period of great strife. Whenever we turn on our radio sets we hear of nothing but the clash of arms between the warring nations. We may dislike war and may believe in peace, but the necessity of learning the use of arms to defend one's hearth and home is being commonly realised by what is happening around us. In ancient times it used to be a part of the training of a properly educated young man to be able to wield the pen and the sword with equal facility. As observed by the late Maulvi Nazir Ahmad in a verse composed by him when the riding squad of the M.A.O. College, which is now the Muslim University of Aligarh, was being organised, it is necessary that the students should come out with the capacity of a double-edged sword and be soldiers as well as penmen. The verse in Urdu runs as follows:—

سٹوڈنٹ تیغ دودم بن کے نکلیں   سپاہی اور اہلِ قلم بن کے نکلیں

In deciding to start the Military Training you have put this idea into practice. It is in the fitness of things that the young men of Bahawalpur may follow the example of their noble ruler who combines in his person the qualities of a soldier and a statesman. You have done well also to follow the splendid lead given by him to his subjects and to his countrymen in British India, in his appeal to help the valiant British people in the war which has been forced on them and which they are fighting with a heroism which has received unstinted admiration from all parts of the world. I am glad to see that due emphasis is laid in this College on sports and out-door games. It is now a well-recognised principle of

Convocation Address

(Delivered by SIR SHEIKH ABDUL QADIR)

Mr. President, Mr. Principal, and Gentlemen,

I am grateful to you for affording me this opportunity of renewing my acquaintance with the Sadiq Egerton College and with the capital of Bahawalpur State, the educational progress of which is represented by this institution. I saw it last more than ten years ago. It has steadily grown since in its activities and equipment. You are fortunate in having as your ruler an enlightened Prince who has inherited from his Abbaside ancestory a genuine love of learning, and is desirous of doing all he can to place the advantages of modern education within the reach of all classes of his subjects. In achieving this object His Highness has been loyally helped by his able Ministers. In your Education Minister you have a zealous, though unostentatious, worker in the cause of Education.

The College may be congratulated on the developments mentioned in the report to which we have just listened. The opening of the Honours classes in Persian and English, the introduction of an Industrial Section in the Science department and the starting of an Engineering class are all steps in the right direction. They show that on the Arts side you aim higher than mere pass degrees, and on the Science side you are not forgetting the need of making a practical use of knowledge imparted to the students. The new feature, however, which has a special significance at the present

A few years ago important religious functions and celebrations were organized by the College Union as representing the entire student community. But unfortunately they have been stopped somehow or other. The celebration of such religious function, as Milad-un-Nabi, Meraj, the Death anniversary of Hazrat Ali and Imam Hussain, in the College, will be very profitable to our cause, as it will create among the students greater interests in matters of religion and will enable them to understand the true significance of religion. We are confident that the College authorities and the students will pay due attention to our suggestion and will celebrate in future all the important religious functions.

* * * *

The long winter term, with its numerous activities is fast coming to a close and with the approach of examinations the atmosphere in the College is growing serious and grim. The fear of the coming examination hangs over our heads like the sword of Damocles and cheats us of some of the pleasure of life, the fun and frolic, light-hearted gossip and the nocturnal revelries. Burning the midnight oil and poring listlessly over the pages of dry-as-dust books is our main occupation in these days. These are the days of hard struggle. We march on like "camels of drowsed contemplation" 'breaking the slumberous desert air' with invisible bells, but are confident that at the end of all these difficulties and hardships awaits the golden fruit of success for us.

Good speed to all. Adieu!

EDITOR.

The problem of rural reconstruction is the most important problem confronting India to-day and is calling for an immediate solution. The greatest service that we can render to humanity in this age is to find out a solution to the problems of the Indian villagers, the most ill-fed and ill-clad people in the world. But it must be known to all that no problem is so difficult and so stupendous as the problem of village uplift, and people, not inspired by the sincerest motive, cannot do the hard task of reforming the village-folk. Therefore those who have a sense of responsibility and sympathy with the masses, and are inspired by a genuine love of service and self-sacrifice, should come forward and replace weaker men.

The above remarks, though a bit harsh and unpalatable, have not been written in a spirit of uncharitable criticism, but have been inspired by the sincerest motive, with a view to awaken the conscience of the students, so that they may earnestly and honestly set themselves to reform the village folk, the back-bone of the Indian nation.

We trust that our appeal will not go unheeded. Our students will cultivate a sense of responsibility and will come forward to join the Social Service League not for the sake of a "Roll of Honour" but for the good of humanity.

* * * *

For a few years we have not been making any progress in sports. The result is that we often lose University matches in the very beginning. The sports authorities are requested to examine and report on the conditions of sports in order to introduce necessary improvements.

Mr. Nazeer's regime has ushered in a period of great progress for the Library.

* * * *

The different tutorial groups wield tremendous influence on the life and the activities of the students.

The Majid Literary League, under the guidance of Dr. Shuja and Mr. Shaheed, is doing its work very successfully as a nursery of the brilliant and talented poets and writers of prose, and possesses a unique and enviable position among the literary circles of Bahawalpur State.

Bazm-i-Adab and **College Union** have begun to evince happy signs of life and improvements after a long period of lethargy.

The Historical Society and **the Economic Society** have been very active in the College throughout, and have had a full and varied programme of activities. But we are sorry to say that the **Mathematical Society** has not shown the least signs of life during the last year. Similar is the case with the **Science Society.** The **First Year Literary Circle** founded last year is showing signs of decadence. I fear that if nothing is done to improve it, it will sink into the terrible ocean of non-existence.

The Social Service League was founded in 1938, and had for its aims the welfare and uplift of the poor villagers of the State and the British Punjab. We were told that the chief aim of the society was to create a keen interest in rural reconstruction and for this purpose the society would organize excursions to villages from time to time. But we are pained to see that nothing has been done so far in connection with village uplift.

In the evening at 7 p.m. Sir Abdul Qadir delivered a speech on "Female Education." It was an inspiring speech and made a lasting impression on the people of Bahawalpur.

The next day at a quarter to 3 P.M. we paid a visit to Sir Abdul Qadir at Abbas Manzil in order to have the benefit of his views on certain problems of Indian and international importance. While discussing the causes of the present war Sir Abdul Qadir said that the present upheaval was due to the absence of religion in Europe. He further remarked that he gave precedence to religion over everything else, as religion leads to peace, happiness, and contentment. Islam is the only religion in tune with nature and offers a solution to the vicissitudes of life, the caprice of fortune or the buffets of circumstances. It can help man, as it has helped him in the past, to reach the borders of divinity and to maintain the correct equilibrium of mind and matter or the true conduct and purport of life in this world and in the hereafter. Talking on Socialism he said that he did not believe in it at all as it has divorced religion and aims at equality through the stomach. He said that principles not based on religion can be easily violated, and cannot save men from starvation, misery, and mischief.

* * * *

Mr. Nazeer, our new librarian is a man of kind and sympathetic nature and genial personality. Within a short time he has won the affection and esteem of the entire student community. He has already effected many improvements in the library. A large number of books both in English and Urdu have been added, and a keen interest in the library has been created among the students.

Muslim education. It has also appointed a Touring Committee under the presidentship of Sir Azizul Haq, Speaker of the Bengal Assembly to examine and report on the conditions of Muslim education and to find out ways and means to overcome difficulties in the way of preparing a scheme of education purely based on Islamic lines. The Committee has toured the whole of India, and is now busy drafting its report to be presented to the main Committee in due time.

The Committee visited Bahawalpur in October last. It also interviewed His Highness the Nawab Sahib Bahadur at Dera Nawab Sahib, and sought his advice and opinion about the matter. We learnt that His Highness was very much pleased to interview the Committee, and sympathised with its noble aims and objects.

* * * *

The annual convocation of the College was held this year on the 22nd February, 1941. A large number of State officials, besides the citizens and the students, assemheld on that occasion in the College Hall. Ali Martabat the Minister for Education presided. The convocation began at a quarter past twelve, and Sir Abdul Qadir read the Convocation Address. Speaking at length on different topics, the worthy speaker advised and appealed to the students to "be brave" and to face the storm and stress of life in a spirit of cheerfulness. While talking on the problem of education Sir Abdul Qadir said that the chief aim of education is not to make us capable of getting some paying employment, but to make us men in the real sense of the word.

Lord Curzon brought the entire educational system from the primary to the university stage under State control. This measure of his evoked a hurricane of protest. The National Education movement was started, but as it was born amidst political excitement, it soon fizzled out.

Then came another great political upheaval, the Non-co-operation movement. This movement made the people of this country think furiously about the problem of National Education, but unfortunately it proved too partial and exclusive to be accepted by all.

It was a hundred years ago when there was a transfer of power from the Mughal to the Britisher, and Sir Syed drafted a scheme of education to prepare the Muslims to play their role in the New Order. The object of Sir Syed's scheme was to save the Indian Muslims, their culture, and civilization in this country by evolving a system of education which had the virtues of the western and the eastern systems without the defects of either. This system of education worked well till the great war of 1914. But after that the world changed, and a new situation arose which created new educational problems for the Muslim educationists to solve. A system of education on Islamic lines, which could equip the youths to meet the modern needs and requirements, and could prepare them to achieve their main object 'Free Islam in a free India,' became the need of the times. The All-India Muslim Educational Conference has at last realized the necessity of preparing a new scheme of education to meet the new situation and, it has appointed a Committee called the Kamal Yar Jung Committee which has issued an excellent questionnaire on

task. Last, but not least, I owe allegiance to the Almighty God who made His poor humble creature like me able to do "a service to the Muslim Millat and the Muslim Youth."

* * * *

It was with feelings of the greatest joy and satisfaction that we received the news that our benevolent ruler has been created a Grand Commander of the exalted order of Star of India. The high-souled ruler of a big and progressive State, His Highness is an able statesman and administrator, and the title conferred upon him is a recognition of the great qualities of head and heart of His Highness, the Nawab Sahib. We humbly and respectfully present our felicitations on this happy occasion to our beloved and benevolent ruler. We are sure that His Highness is destined for unprecedented recognition in years to come. May God pour His blessings on His Highness and carry him from honour to honour. Amen.

From the 24th of January to the 26th there was great enthusiasm in Bahawalpur in connection with the celebrations of the 'Title Ceremony.' These ceremonies were celebrated with great eclat throughout the State, particularly in Bahawalpur City. These have been the happiest days in the lives of the citizens of Bahawalpur as they have been privileged to witness scenes of splendour and magnificence beyond their dreams. Sweets were distributed among the students of the State and prayers were offered in mosques and mandirs for the long life and prosperity of His Highness.

We again humbly offer our best felicitations to His Highness and pray that he may live long to receive more honours and to rule over his vast dominions.

danger from within or without. Iqbal was a man who saw life in its ultimate realities. Unlike Gandhi he preached:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — ترا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

Iqbal not only awakened the people to the changes passing over the world, but also inspired them with the best ideals of Jihad and Khudi. He always concentrated his attention on human destiny, particularly the destiny of the Muslims. His poetry gives expression to the spirit of Islam, as a religion and as an ideal society based on the ultimate realities of life. He is rightly called "the Awakener of Islam"—and I am confident that the teachings of Iqbal will in due time bring about the desired change in the world:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

Although he is known as a poet to the world, Iqbal was more than a mere poet. He was a prophet of humanity and the bearer of a new idea of illuminating life with a fresh significance. The young generation of Muslims particularly of the Indian Muslims, has unbounded esteem for him, and looks up to him as their philosopher, teacher, and guide. Most of the essays published in this magazine clearly confirm this statement.

Before I conclude my humble appreciation of Iqbal, I avail myself of the opportunity of thanking all those who extended to me their heartiest co-operation in this sacred

of modern society. He was a great Socialist, and had great love and sympathy for the labouring classes.

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو   کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے   کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی   اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

Although his poetry smacks of Socialism, Iqbal had no faith in the Carl Marxian philosophy of bread, which aims at equality through the stomach, and has divorced spiritualism from life.

Iqbal's was a great and elusive personality. Besides being a first rate poet and an eminent thinker, he possessed a charming personality that commanded a world-wide circle of admirers. Iqbal was a lover of humanity, and never differentiated between man and man. He was by nature an independent man and lived a life of liberty at all costs. He was simple in his habits and honest and fair in his dealings. He never ran after wealth and even did not accept it when it came to him by way of tribute. He strongly held the principle:

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ   ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

But despite all his simplicity, Iqbal was not an ascetic. He was a true Muslim, and his life was a happy combination of spiritualism and worldliness.

Iqbal was a great teacher and preacher of Islam, and a fearless advocate of its cause. He always fought bravely for the cause of Islam and stood like a rock against every

As a Muslim politician, Iqbal was an orthodox Pan-Islamist. He not only desired the revival of Islamic society, but wanted to create a true Muslim State with its typical politico-economic system. Therefore he insisted on the unity of Islamic countries. Meesaq-i-Sadabad is to some extent the fulfilment of the dream of Iqbal, and let us hope that it will bring about a union of souls among all the Muslim nations of the world.

As an Indian politician Iqbal sought the unity of Indian nations not in the negation but in the mutual harmony of the many. He held the 'two-nation theory,' and never favoured a polity on a national basis. He was never prepared to pay the heavy price, the suppression of individual culture, in order to create a nation with one mind. As a solution of the Hindu-Muslim problem he proposed the division of India into two parts—Muslim India—now known as Pakistan and Hindu India. Presiding over the Allahabad Session (1930) of the All-India Muslim League, he said, "....the formation of a consolidate North-West Indian Muslim State appears to me to be the final destiny of the Muslims at least of North-West India."

Although this idea of Iqbal has undergone a little change since then, yet it remains a great directing force till now. The policy of the All-India Muslim League and of the All-India Muslim Students' Federation and the celebration of the Pakistan Day throughout India clearly show that the efforts of Iqbal are bearing fruit at last.

As an economist Iqbal preached the economic system of Islam to be the only solution of the economic problems

In order to conquer both the visible and the invisible forces of the universe, the Ego should strengthen through love, for:

از محبت چوں خودی محکم شود   قوتش فرماندۂ عالم شود

Iqbal had great faith in the strength of the Self as an object to which all human energy should be directed. Whether in the case of the individual or the nation self-affirmation is necessary; as it creates new values in life.

Iqbal was born and brought up in a home typically Muslim, and, as such, had a great esteem for religion. He gave precedence to religion over everything else, and considered it to be the heeler of all our wounds and worries. Islam presented to him an ideal religion, based on the ultimate realities of life. His zeal for the revival of Islam was not due to any religious fanaticism, but was prompted by the noble desire of freeing humanity from the unreal territorial, racial and linguistic distinctions which are breaking up humanity into warring clans and are causing perpetual disorder on the face of the earth.

As a statesman Iqbal was a democrat. But he never favoured the western form of democracy. He also doubted the ability of the masses to govern themselves properly and advocated the cause of the fittest man to run the system of government:

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو   کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمے آید

impervious to the life outside. Iqbal showed a full interest in life and as such was far more responsible for the present changes in the Muslim Society than any other thinker. He had an independent mind, a free soul, and a vision unclouded by mundune vicissitudes. Such an attitude of the mind directed his art towards the preservation of 'Self.'

Iqbal's contribution to world thought and literature is of a highly creative value. He has interpreted philosophy, science, politics, and economics in the light of the Holy Quran.

Iqbal was a realist in his views. His conception of life was that of a realist. He preached:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

With such confidence in the immortality of life Iqbal faces the hardships of life with a smiling face and considers them to be the right path leading to the golden threshold of success. He says:

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست　　گفتا مئے کہ تلخ تر او نکوتر است

"All life is individual; there is no such thing as universal life. God himself is an Individual. The moral and religious ideal is not self-negation but self-affirmation, and man attains to this ideal by becoming more and more individual and more and more unique."

وانمودن خویش را خوئے خودی است　　خفتہ در ہر ذرّہ نیروئے خودی است

Amongst the great men to-day Iqbal stands on an eminence by himself. He was the only Muslim of this century to enjoy a world-wide fame and international recognition. He was one of the most illustrious personalities of the modern age, which had lightened the darkness and chaos of the world. His influence on contemporary life was too great to be over-emphasised. Therefore his death came to us like an upheaval that shook the whole structure of our universe.

One of the greatest men of the world, the real benefactor of humanity, was Iqbal. His was a many sided genius—he was a poet, a philosopher, a statesman, a religious leader, and a distinguished member of the Lahore High Court Bar. No country of the world has ever had a more versatile genius. But it is as a poet that Iqbal enjoys a world-wide reputation.

At an early age, when he was a student at Government College, Lahore, Iqbal became wonderfully proficient in literature and philosophy both of the East and the West, and was a promising poet who displayed great skill in composing verses.

Iqbal, although manifestly a born poet, never closed his eyes to the stern realities of life. He, unlike some other poets of his age, had had a sense of dignified restraint. He was fully aware of the fact that the highest interests of life are moral. He was a man of letters with this hall mark, not as an end in itself but as an instrument of the art of living.

Iqbal's poetry never isolates itself from the general current of life into some enchanted region of its own—

equipment. We know full well that there is a lot of latent talent among our students, and that only a little encouragement would do much to bring it out. We assure our fellow students that the pages of the 'OASIS' are always open to them to give their views on any subject they like. They should avail of this opportunity to present to the world the thoughts and feelings of the Bahawalpur Youth. We trust that our appeal will be duly considered and in future our students will make the best of the opportunity offered by the OASIS to show to the world that they are capable of doing serious thinking on important problems confronting the world, and above all can make a valuable contribution to the advancement of culture and civilisation.

* * * *

It was on the 17th December, 1940, that a sincere friend and well-wisher suggested to us the idea of bringing out the 'Iqbal Number' of the OASIS. His suggestion appealed to us, and we made up our mind to produce the 'Iqbal Number' of our magazine. In this connection we approached some of the ardent adorers of Iqbal and requested them to co-operate with us in this sacred task. To our gratification and joy we met with a very encouraging response, although a few of those whom we invited to participate in bringing out this important number did not condescend even to honour us by acknowledging our invitation. However, our efforts bore fruit, and now we are publishing the 'Iqbal Number' of our magazine, which is a substantial and highly valuable contribution to the world of thought and knowledge, civilization and culture.

Editorial Notes

Before making any remarks we feel that we owe an apology to our readers for our belated appearance. An interval of nearly five months has elapsed since our predecessor brought out the last number of the magazine and transferred the heavy responsibility of guiding the destinies of the magazine to our frail shoulders. When we consider the high standard of efficiency and get-up reached by the magazine under the guidance of our able and efficient predecessor we feel a little depressed, but, however, we are proud of this heritage, and shall do our best not only to maintain but to try to excel the standard set up by any of our predecessors. It may sound Utopian, but with the grace of God and the hearty co-operation of our College-fellows we hope to reach a standard higher than that of any of the other College magazines. In this connection we would like to remind our College students that the OASIS is primarily an organ of the students and a true mirror of their life, activities and mental attainments in the college. As such it is the first and foremost duty of the students to extend to it their hearty co-operation in order to make it worthy of their great alma mater. But we are sorry to say that of late our students have not evinced proper enthusiasm and interest in the magazine. The result is that we receive fewer articles than the notices we issue. This is only due to the indifference of the students and not to any lack of proper intellectual

Oriental College,
Lahore.

Dear Mr. Shaheed,

I thank you very much for your letter. I would have been very happy to contribute to the OASIS, but as I have received your letter only to-day, I find it impossible for me to send you anything on Iqbal in such a short time as to make it reach you before the 15th. I send my thousand apologies for not contributing to your 'Iqbal Number,' but later on I might be able to contribute.

I congratulate you on bringing out the 'Iqbal Number' of the OASIS. This is the type of work to which our young-men should attend. It is a service to the Muslim millat and the Muslim youth.

Wishing you a happy future and success in life.

Yours sincerely,
(Sd.) MOHD. BAQIR NASIM,
M.A. (Punjab), Ph.D. (Cantab)
(University Professor)

Sir Abdul Qadir's Message

What better message can I give to the students than to draw their attention to Iqbal's famous verse:

بُت پرستی تو ایک مذہب ہے   کُفر غفلت کو جانتا ہوں میں

Cast off all sloth and lethargy and do constructive work for the welfare of your nation and your country, not in the narrow sense of modern nationalism, which threatens to annihilate all culture and civilisation and enthrone in its place barbaric impulse and motive of the primitive man, but in the sense taught by Islam which treats all nations as one family.

I hope that the students will not confine themselves only to the publication of 'Iqbal Number', but will try their utmost to follow in the foot-steps of this great son of Islam in the noble ideals which he set before them and which he struggled all his life to achieve.

Sd.| (Sir) ABDUL QADIR.

Messages

10, Aurangzeb Road
New Delhi,
26th February, 1941.

Dear Sir,

I regret that your letter of the 17th instant escaped my notice which was mainly due to pressure of work.

You will perhaps realise that I have to attend to numerous matters of very great importance regarding the political struggle going on in this country and the entire organization spread all over India.

As regards the message I can only repeat: we should organise ourselves under the banner of the All-India Muslim League, the beloved organisation of Sir Mohd. Iqbal (peace be upon him), and should take up a constructive programme for the uplift of our people. I am glad that the Muslim students are rising to the occasion, and I hope that before long Muslim India will resolve itself into an irresistible and invincible force for the achievement of our ideal.

Yours faithfully,

(Sd.) M. A. JINNAH.

nation can be based. One fixed code of laws, they say, cannot stand for all times in this swiftly changing world.

This brings us into a charming realm of discussion, where the morning breeze blows softly, the roses smile silently and the nightingale sings sweetly. I wish, I could get into that enchanted land and enjoy a good hearty discussion with the learned men of the world, the 'Ustad' as 'Ustad' of course being the president of the Assembly. But this requires mental exertion and deep thinking. For this, there is no time with me at present. I unwillingly leave the subject to take up my pen again when circumstances permit.

world. Religion they say, has lost its usefulness to the human society. The social regulations and social **mores** imposed by religion have now been replaced by social and political codes. The superhuman element of religion is neglected by man. Of all forms of religious systems, monotheism only has survived the strong and persistently aggressive tests of the modern machine age. The material atmosphere of our society does not admit these ideas to flourish. They also say that monotheism is also in great danger of being attacked, if not completely replaced by some material ideas of a Darwin or Huskal. The world may adopt a new system of mental exercises and spiritual codes, as Russia has already given a lead towards this goal.

Iqbal differs from these thinkers in many ways. We must admit that these are theories not facts based on scientific experiments. Everyone of us is justified in formulating a theory as long as it comes out to be true according to the tests of practical life. Otherwise it is automatically rejected in favour of those theories which can answer the facts as they stand. Time will prove the prognostigations of Iqbal, one side or the other.

There is, however, a school of thinkers who dominate the modern social theories, and govern the laws of progress of the world; they are not prepared to accept the social philosophy of Iqbal as truly favourable to social development. They say where is pan-Islamism? It has in fact, never adopted a true practical shape. Now that the office of the Caliphate has disappeared from the world, this pan-Islamic movement can find no ground to stand. They even dispute Tohid and Risalat as the basic principles on which a

16. Wisdom remains in doubts of cause and effect. Cover the defects of wisdom with love.

In modern times 'Social Science' has been developed to a sufficiently high pitch. It discusses the laws which regulate the career of success or failure of an individual or a group. Any of the modern authors, Mac Iver, Hobhouse, Barker, Joseph, etc. will give sufficient material for study. For the special problem of Indian nationality, Tagore, Dutt, Marvin, Risley, Gilchrist, Beven, Besant, Pannikar may be consulted. They disagree with Iqbal in many points. Iqbal has taken up the salient features as discussed by modern social science, and portrayed them in a garb of poetry with Islamic background. But he has selected from the whole discussion those points only which he liked. Some of these are definitely weak according to the authorities on social science. The individual and the society according to them are becoming more economic minded than social or religious. Religion they say, is a dead force. It is never to return. There were days—a phase in the intellectual development of the human race—it was a stage, when religion and prophethood brought into existence groups and nations. They were capable of great achievements. But that stage is past. Now the world has developed far beyond it, the intellect of the human species in general has proceeded much higher. It cannot go back. It will only go forward. The idea of spirits and ghosts is lost to us. Whims and fancies have got no weight with the modern world. Science and the applications of science in the modern world have changed the very standard by which we measure success. We have adopted a different line of thought. They say, in the coming world, economics, science and politics will rule the

6. The national mind of a group is perfected by producing the sense of Khudi in the nation as a community.

7. Homeland is not the fundamental factor of nationality. It produces divisions and war.

8. For the existence of a nation a physical centre is necessary. (Is it self-contradiction? I can feel others but this is not the proper place for them).

9. A nation can only be organized when one law covers all the individuals.

10. In the age of degeneration, as ours is, it is better for the individual to follow, than to construct his own new lines of thought. The nation thus develops one mind.

11. For the progress and expansion of a nation, it is necessary to conquer physical forces by science and knowledge. Make new inventions and thus conquer the world.

12. A nation must have an aim in view, or it will deteriorate.

13. A nation continues to live only by preserving its traditions and history.

14. Motherhood is the real preserver of a nation. Mother teaches religion, traditions and obedience to law. Sons are the greatest wealth of a nation. Modern age is full of deceits and fallacies. Mothers should save their children from its poisonous affects. Mothers are responsible for producing a suitable coming generation.

15. Love by its firm resolution conquers the world. Love finds peace of mind in freedom. So be independent.

17. The independent man only is the real man; a slave is only a moving machine.

18. Fight with the world till you conquer it and bring it round to your requirements or die fighting like a brave man.

This is as regards the individual. Now we come to the second book Rumuz, which deals with the life of the group (community or nation).

DEVELOPMENT & SUCCESS OF A COMMUNITY

1. Khudi is the inner light which creates the sense of individuality in a person.

2. But our task remains unfinished without becoming a part of the whole—the nation. This is the Bekhudi (Selflessness) of man.

3. Modern European political theory propounded by Machiavelli is misleading and causes sins and struggle.

4. Modern world has created a new god, which consists of throne, country and race. It should be smashed. Then the world will know peace.

5. A nation is built on two factors.

   (a) Tohid—God is one. Following this law of 'Oneness' all individuals of a nation should become one.

   (b) Risalat (prophethood) gives a new law and teaches equality to mankind.

5. Khudi proceeds towards perfection by passing through three stages.

(a) Obedience makes the group, to which the individual belongs, strong.

(b) Control of desires makes us more useful to the community.

(c) Man should conquer physical forces by science and knowledge.

6. Love is the cause of the development of Khudi.

7. Intellect should be combined with love, to make full and appropriate use of intellect.

8. Self-negation (killing of Khudi) kills the inner and outer powers of man.

9. Inner light which feeds on Khudi, is the creative genius of man.

10. Desire is the spell by which we can conquer the worlds, known and unknown.

11. Action is the pith of life.

12. Strength is the truth of life.

13. Weakness breeds falsehood.

14. Fear is the source of many evils.

15. Firm resolution and hard life, lead us to success.

16. Modern knowledge is misleading. We should follow the old traditions.

Now we will pick up from the narrative, the laws of development and success for the individual and for the nation, which lie hidden in the text of these two books. We will now sift out the arguments brought forth by Iqbal, in favour of his doctrine of success in life.

His two books Asrar-i-Khudi and Rumuz-i-Bekhudi, respectively deal with the individual and the nation. He describes in his Asrar how a person can develop and progress and in Rumuz he takes up the programme for a group —a collection of individuals: a community. We will also take up these two sections of the laws from these two books separately; of course Asrar, with its right of precedence coming first.

We will now study in a connected logical form the line of argument developed by the poet, disregarding his arrangement in the books. We will re-arrange the points. It will be better to take up the points systematically, as they logically proceed upwards and to state these categorically.

DEVELOPMENT & SUCCESS OF AN INDIVIDUAL

1. Man in the undeveloped or unregenerated state is nothing better than dust.

2. He possesses inside him immense hidden potentialities.

3. Khudi (Self or Ego) brings these potentialities into action. Individuality of objects is due to Khudi.

4. Superman who has perfected his Khudi leads the world.

of the controversial points discussed by him in his works. We may thus be able to analyse and explain the strong Muslim ideas expressed by him in the vigorous days of his poetic career. I have been in touch with him from 1916, when I was just a student of F.Sc. class in the Lahore Government College. Then also I used to write stray verses, but was absorbed in the study of science. However I was interested in good poetry, fine arts and social development. I have watched, known, studied and analysed Iqbal from this time till his death. During this period the contact was strong or loose the interval between and the number of meetings was large or small but the contact was never severed. It would be very fascinating to analyse the 'Philosophy of Life' as propounded by Iqbal in that light. It will interest many of his admirers, the thinkers in the field and all my friends between whom and myself Iqbal stands as an unbreakable bond of union. But there is no space for it. I have taken up my pen to write an article for the 'Oasis' and the pages of a College Magazine would not suffice for it. We postpone it till some more suitable opportunity arises.

GENERAL FEATURES OF THE PHILOSOPHY

But philosophy of life interests all of us, individuals or nations all over the world. All of us men or groups wish to develop, progress and dominate. It will therefore be of interest and use to Man in general to know what the pith of the laws of success and progress is, as these have been propagated by Iqbal. We leave aside, religion or country and study progress in general.

عقل را سرمایہ از بیم و شک است   عشق را عزم و یقیں لاینفک است

آں کند تعمیر تا ویراں کند   ایں کند ویراں کہ آباداں کند

علم را بر تن زنی مارے بود   علم را بر دل زنی یارے بود

I had travelled all over the Islamic belt of countries including Kashmir, Afghanistan, Persia and Iraq. He was a student of Islam and his message was addressed to the Muslim nations. So he felt interested in getting first hand information regarding these countries and nations. He wanted to know the social, political and educational conditions there. Then we would discuss what lines should be adopted to improve them. How Muslim countries could rejuvenate themselves, how they could progress and become an effective force in the world.

In his later life at times when some of us were together, like Shifa-ul-Mulk Hakim M. H. Qarshi, Sayed Nazir Niazi and others, we used to have open debates on the subject of Congress, Indian nationality, the future of India, the future of Muslim community in India, Muslim nations, new developments and so many other problems which cropped up during the talk. Shifa-ul-Mulk (then not Shifa-ul-Mulk) was a Congressite and Iqbal as is clear from his literature a staunch Muslimite, I, a logico-poetical scientist (practical test first) touchstone of arguments and the audience at the same time; and Niazi a makeweight. He would argue for the side which seemed to become weak. He could argue for both, by dint of his knowledge and 'filoosofy.'

Thus, in his company I got an insight into his inner psychology. This would throw a flood of light on some

distinct traditions and religions if they steadfastly and strictly follow their own lines, they can never come closer together. They will never amalgamate. There will be no union and no Nation. Following these ideas he propagated or advertised the "Pakistan" scheme: two nations in one India.

I differed from him in some ideas, as propagated by him, as others did like Shifa-ul-Mulk Hakim M. H. Qarashi. I had a number of chances of discussing with him these points of controversy and finding out what he meant. But he was a very sensitive man. He wrote with conviction. If you questioned him directly regarding some point in his works which you doubted, and indirectly hinted that it was wrong he felt annoyed; with strangers he even became strong. He believed, he wrote what he believed, and believed that what he had written was absolutely right.

At leisure hours when sitting in an easy mood, he expressed doubts. But then I should admit he was not that poet and philosopher who was invincible in argument and remained undefied in extensiveness of information; then he was a barrister, a practising pleader inside whom Iqbal was hidden, in a dormant state. This barrister could talk that way, still he was the nearest associate of the 'Poet Iqbal,' in the world and therefore he should know the poet very well. The expressions may lack in exactitude but they threw light on the inner mental attitude of the author. He was perhaps at the moment, a learned man, full of knowledge and wisdom; and the world of wisdom is full of doubts in his own words:—

accepted the membership of the Legislative Assembly to be in the practical world, to get a practical experience of practical life."

Let us see if the special features of the philosophy, propagated by him, regarding the Muslim community are being applied anywhere in the living world, or there is a chance for them to become active. Here are some of them: love, and love of the Prophet, removal of difference of caste, creed and colour. Muslims' home is the whole world, humbleness is not culture, literature should only have those values which encourage it and refuse literary values, Quran to become the ruling law of the Muslim World, the aim of life of a Muslim is to propagate the glory of One God and not social, economic or scientific development, religion to become the ruling force, a Pan Islamic union should be formed, revive Islamic thought, preserve Tohid, homeland is not the basic factor of nationality, European political philosophy is wrong, follow and do not try to formulate new ideas, smash the forces brought into existence, by throne, country and race. Now if we analyse and consider the arguments we find that some of the forces are active, others are alive, others are dormant, some are ineffective, some have been removed by the anti-forces of the world, some have got chances of revival, others have got no chance of coming back to life again. But the poet delighted in formulating a philosophy.

Iqbal was an Indian and could not forget that he lived in India. If we consider the case of India we find that his philosophy will not apply here. Two communities with

Iqbal was a great student of Islam. He covered the whole field: Quran, Tradition, cultural history, philosophy and modern developments. His "Lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam" in English, show his vast study and mastery of the subject. In these he has made an attempt to corroborate Muslim religious philosophy and the traditions of Islam with more recent developments in the various branches of knowledge. According to him Islam reconciles the forces of 'change' and 'permanence.' An individual or a society should change because 'Self' is always striving, expanding and is in the act of motion. If it is arranged to stop change, that immobility, lithargy and deterioration results which has overpowered the Muslim nations for the last five hundred years. On the other hand like Europe, if a group has got no common principles to regulate the collective life of a group, it knows no bounds. It has no goal. It goes on changing and changing and from Cosmos you go back to Chaos. The cosmos brought into existence by the persistent early efforts is automatically lost by the mutual conflict of the internal forces.

From his early age Iqbal had been brought up in a Muslim atmosphere and his prodigious memory would not easily forget what had been taught to him as a child. His foundation was Islamic and he expounded it in his poetic philosophy. It was a theoretical descriptive narrative, without giving considerable thought to its practical possibilities. He was a poet, a philosopher and a thinker. He constructed his own world, away from the noise of life. He expressed it many a time himself; and once said, "I have

Muslims should **conquer natural forces** by science and knowledge. Man is the Deputy of God and therefore he is justified in his conquest of nature. Make yourself strong by new inventions and then conquer and expand.

A nation goes towards perfection by producing the **sense of Khudi.** This can be done by preservation of national traditions and history. Connect your past with the present and future.

Respect of **motherhood** is real Islam. Mother forms the character of the child and teaches the love of God. Muslim mothers should bring into existence, healthy, strong, God-fearing Mussalmans. The real wealth of a nation are its sons. Mothers are the real makers of a nation and religion. Fatima the daughter of the Prophet is a perfect example for the women of the world. Guide the children of Muslim community towards Islam and save them from the unbelief of modern age.

Now here it is. This philosophy of life or programme for the development of an individual and a nation is so saturated with Muslim ideals and literature that people of other religions would not like to follow it. Even if they wanted to, they would not be able to do so because of the technical difficulties. This means that they will have to become Muslim converts before they can adopt Quran and Muslim traditions as law and ideals of life. So this theme is exclusively meant for the Muslims: Muslims in general, who live in the whole world and not of any particular country. We must admit that Iqbal covers a vast ground.

Homeland is not the basic factor of nationality. By following this principle human qualities in man have disappeared and nationalities have taken its place. In Europe politics has occupied the place of religion and atheism has overthrown religious system. Then Machiavelli an apostle of Satan, made kingdom as the object of worship and thus sowed the seed of Strife. Now artifice and trick are their principles of politics.

Muslim community is eternal because God has promised to preserve it.

A community cannot be organized without law and the **Quran** is the law of the Muslim nation. The Sufi and the religious preacher both have forsaken the Quran. All Muslims should live according to the law given in the Quran.

In an age of degeneration like this, **Taqlid** (to follow) is better than **Ijtihad** (to strike new and original paths). Follow Muslim traditions and history.

Character of Mohammad (the Prophet), his manners and habits are an example for the Muslims.

Physical Centre of the Muslim community is the Ka'ba. **National** aim of the Muslim community is the propagation of Tohid.

A **New** god has been created by the world: throne, country and race. This is against the Muslim ideals. Mussalmans should destroy this god otherwise they will have to explain before God on the day of resurrection.

Bekhudi should be distinguished from Khudi. The inner light which gives individuality to a man and is constantly at war (inside and with the external world) is called Khudi. When an individual considers himself to be the member of a group, his Khudi breaks up and becomes Bekhudi, submission to a larger whole—the nation.

Tohid and Prophethood are the fundamental principles of Islam:—

Tohid means there is only One God. From this he concludes the unity of the Muslim community. Doubts vanish by belief in one God and man determines to Act. The Muslim nation is built on the principle of Tohid and is therefore free from the bonds of country or race. The Mussalman believes in the 'Will of God' and therefore vices like despair and sorrow do not enter his mind. The fear of God only is true belief.

Prophethood (Risalat) is the soul in the body of a nation. The Prophet is the cause of union of the Muslims all over the world. Our Prophet Mohammad was the last Prophet. He taught freedom, equality and fraternity to mankind and thus made the whole world one nation.

Wisdom and Love both are active forces in this world. Wisdom lives in a world of doubts created by causes and reasons. Love has got a steadfast resolution and the solace of its life is Freedom. It makes impossibilities possible.

Muslim community has got no **physical limits,** because this nation is based on Tohid and Risalat. The face of the whole earth is their mosque. All over the world they are one nation, and they are free to move about anywhere.

Life-Aim of a Muslim is to preserve and propagate the name and glory of One God. We should fight and conquer for this purpose alone.

Knowledge if alone, is a source of trouble and useless strife. It must be mixed with **love.** Modern knowledge cannot supply the necessary fire of love. I have searched for it in vain in Europe.

Pan-Islamic Union all over the world is a necessity for the development and success of Islam. The Muslims should follow their own traditions. They should become free and bring into existence, independent States. A slave names his defects as fate. The free only can become a constructive genius. He makes his own fate by modelling the world. There were days when the Mussalman was the ruling force of the world in all the spheres of life, knowledge and science. Modern world owes a debt of gratitude to them. O God, give to the Muslim, a spirit of progress and conquest. Give them faith and unite them into one Pan-Islamic body. But, Iqbal says, I am alone absorbed in my thoughts, O God, spread my ideas and let all the Muslims understand me.

RUMUZ-I-BEKHUDI

Now we will pass through Rumuz the second book of Iqbal on the subject.

Revival of Islamic thought is a necessity so that the Muslim world may progress. Follow the law of the Prophet and the Muslim traditions.

Fraternity and Love, and will lead Islam towards success and conquest. Ali was such a Superman.

Struggle is the law of nature. A MAN puts up a constant fight with the forces against him and conquers. He takes it a greater honour to die fighting like a MAN, if he cannot conquer; but he will not submit. To show mercy out of place proves our own weakness of being cold in blood.

Weakness degrades a man, it deprives him of high character. Weak people sometimes satisfy themselves or deceive others by calling themselves polite, humble or incapable of doing harm.

Strength is the fruit of our existence. By dint of power, falsehood even becomes truth, and vice is accepted as virtue.

Programme of Muslims all over the world is to follow the word of God. Do not be afraid of anybody except God, become strong, progress, expand and conquer. The enemy is a hidden friend of yours because you improve by putting up a fight with him. Know your Self, develop your Ego, preserve your Khudi.

Now to prove an argument that Muslims should stick to their own culture, traditions and religious laws, Iqbal narrates a curious story. A Brahmin conceived the idea of worshipping One God and a Muslim religious leader advised him to follow the foot-path of his own forefathers. Thus he deduces that in order to keep our Khudi alive we should follow our own Muslim traditions and religion.

Literature of a nation should be such that it leads a nation towards progress, success and victóry. A poet who gives a dose of opium through his verses is doing a great harm to the cause of the community. The task of Islam is still unfinished. Muslim nations should sift out their literature and reject that part of it which is harmful. They should improve their character and formulate a successful programme for the future.

There are **three stages** through which Khudi develops: (1) Obedience, (2) Control of desires, (3) Viceregency of God.

Obedience to certain set of laws, shows us the sphere of our freedom. It is due to the obedience to the law of unity that groups can become strong and progress. The Muslim should obey the laws as prescribed by the Prophet Mohammad.

Control of desires which can also be called control of Self, gives to the man necessary character. All fears are removed from the mind by the sword of 'La Illah,' and man is only afraid of God. The love of all things—property, money, etc.—is dominated by the love of God. Nimaz kills evils and unbelief, Haj teaches migration, and Zakat kills the love of money.

Viceregency of God is an attribute of man. He has been appointed as such and is therefore authorized to control and rule the forces of the world. A "Superman" gives new life to the world and changes its face. Islam is waiting for another Superman who would give practical shape to

activities of the universe. Due to Khudi the individuals unite to form groups and parts connect themselves in a system. The orderliness of the universe is due to Khudi. Organization of a group, laws, customs, research all are the effects of Khudi. Man or group wishes to progress to conquer to expand, and therefore brings into existence these forces. Khudi must have some **aim,** some object in view otherwise it cannot flourish and these are its aims.

Love is the instrument for the development and persistent excitement of Khudi. You should learn to love. Your object of love is the Prophet Mohammad. He gave to the world a new system of laws.

The Prophet removed all differences of caste, creed and colour. The whole world is the **home of the Muslim.** For our love towards the Prophet we should obey him.

Requests and beggary deteriorate Khudi. Earn your own livelihood and do not beg from others. Artisan is the friend of God.

Self-negation kills the virtues of a man. Self-negation or self-denial means, to not to appreciate the virtues of and not to develop Khudi. Resolution, character, high position and prestige all are lost to the person or nation, and this is called "moral or cultural" development. Plato was mistaken in propagating these views. His philosophy has done a lot of harm to the Muslim community. The Sufi, who follows this doctrine and tries to loose his Self in the greater whole is also mistaken.

He admits that he has derived from Rumi and has based his poetry on Rumi. It is clear thus in his own words that Iqbal follows the Muslim traditions.

But let us go back to Iqbal and see what actually he has to say regarding the philosophy of life. We will discuss it with him. But he says I have already expressed my views on the subject. The two books from his pen, which deal with the subject are Asrar and Rumuz. They present the leading ideas of Iqbal in a connected form, while in other books he has given touches or variations of the same or similar themes. The books in their texture are loose and as we pass through them do not see a clear picture of the whole theme. The details are interesting and full of poetry, one feels absorbed in them and the 'Whole' is lost in the 'Parts.' Now we will proceed to construct the whole from these parts. We have already given the contents of Asrar-i-Khudi and Rumuz-i-Bekhudi in the last two chapters, from one end to the other, i.e. page by page as they occur in the two books.

This time we will pick up the salient points from the text, remove all the poetry and see them in clear day light. The best course would be to pass through the two books again and see what the main features of the Philosophy of Life, as preached by Iqbal, are.

ASRAR-I-KHUDI

Iqbal makes 'Khudi' خودی (Self or Ego) as the basis of human life, individual or collective. He says that the individual is distinct from other living or dead beings because of his Ego. This Ego pervades all the spheres and

مستیٔ او ہر زجاجے را شکست ‏ ‏ از خدا ببرید و ہم از خود گسست

آنچہ او جوید مقامِ کبریاست ‏ ‏ ایں مقام از عقل و حکمت ما وراست

زندگی شرحِ اشاراتِ خودی است ‏ ‏ لا و الّا از مقاماتِ خودی است

او بہ لا درماند و تا الّا نرفت ‏ ‏ از مقامِ عبدہٗ بیگانہ رفت

Nietzsche has also been dealt with by Iqbal in his "Piam-i-Mashriq' twice (P. 238 and 241, second edition, year not given). In these he describes him as

(۱) دیوانۂ بکارگہِ شیشہ گر رسید

(۲) قلبِ او مومن دماغش کافرست

In Nietzschean philosophy God is given no place. His system of arguments is based on causes and effects dealing with this material world. Iqbal on the other hand bases his arguments on the Quran and the religious and poetic traditions of Islam. But the Muslim literature referred to by him in his works belongs to the most vigorous days of Islam. Iqbal is a thorough master of modern philosophy but he does not follow it. He is a fierce assailant and an undaunted critic of it. He disagrees with its principles where they disagree with the religious doctrines of Islam.

In substance and form he is a follower of Maulana Jalal-ud-Din Rumi the greatest Sufi poet in the whole range of Persian poetry. Iqbal admits this in the 'Introduction' to his Asrar. He says: In "My Dream."

روئے خود بنمود پیرِ حق سرشت ‏ ‏ کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت

گفت اے دیوانۂ اربابِ عشق ‏ ‏ جرعۂ گیر از شرابِ نابِ عشق

Rumi invited me to write this philosophy. Rumi he says writes the Quran in Persian: he follows the Muslim doctrines. Iqbal also says:

باز بر خوانم ز فیضِ پیرِ رُوم ‏ ‏ دفترِ سربستۂ اسرارِ علوم

پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد ‏ ‏ از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

life is the desire for victory. Mercy shown out of season shows the coldness of our own blood. Mercy shown out of place hinders our own progress. Superman leads the world. Iqbal differs from Nietzsche in another important respect and that is God. In Nietzschean philosophy God does not enter at all. His philosophy is a chain of causes and effects; arguments and reasons in favour of or against progress and development. He very well succeeds in convincing his readers regarding the validity of the arguments forwarded by him. He has brought forth the new idea of Superman, who is the leader and guide of the world. Iqbal's ideas as regards the qualities of this leader, this Superman, run parallel to that of Nietzsche. The 'Will to Power' as propounded by the two philosophers has got the same spirit of superiority and action. But Nietzsche disregards the hand of the Almighty in moulding the destinies of this physical world in which we live. Iqbal therefore differs from him and proclaims his note of dissent in strong terms. In his book "Jawid Namah" (The Book of Jawid; named after his younger son Jawid and means the book of the eternal) Iqbal goes on a journey through the various heavens of the solar system and beyond. He meets various personalities good and bad. The personalities chosen by him are chiefly those who belong to or touch Muslim people. Now in this journey he meets Nietzsche also. [(P. 175, first edition, year not given) I have quoted only seven verses out of the thirty-seven under this heading.]

دیدۂ او عقابان تیز تر   طلعتِ او شاہدِ سوزِ جگر

دمبدم سوزِ درونِ او فزود   بر لبش بیتے کہ صد بارش سرود

"نہ جبریلے نہ فردوسے نہ حورے نے خداوندے

کفِ خاکے کہ می سوزد ز جانِ آرزومندے"

CHAPTER V

Analysis of the Philosophy

We have studied the contents of the two books, Asrar-i-Khudi and Rumuz-i-Bekhudi. We have known what they contain. But it will be better to sift out, and rearrange the arguments forwarded by Iqbal. Then we will be able to analyse his philosophy and to see how far it applies to actual life.

From the discourse we have found that Iqbal derives all his illustrations and proofs from the traditions and literature of Islam. The factors of his philosophy have been supplied by Muslim faith. In his arguments and the line of reasoning adopted, he does not follow any of the previous philosophers. He has chalked out a new line of thought for himself. The individual reasons advanced by him were no doubt propounded for or against certain causes or effects of individual or national development, by other philosophers before Iqbal. There are some thoughts taken from the religious books of Islam, which apparently were in existence before Iqbal. Others have been taken from modern philosophy and sociology. But the line of argument adopted by him and the application of these arguments as developed by him is peculiar to Iqbal. Therefore we may name this 'Philosophy of Life' as propounded by him **'Iqbalian Philosophy of Life'** which is original in its own way.

Iqbal resembles the great German philosopher Nietzsche in one important respect. The mainspring of

Chapter V

Analysis of the Philosophy

the preservers of the capital of the nation. Do not think of the apparent gain or loss. You should follow the footsteps of your forefathers. The Prophet's daughter is an example for you. Take care of the ravages of time and take your children in your lap. Produce a worthy coming generation.

این چمن زادان کہ پر نکشادہ اند   ز آشیانِ خویش دُور افتادہ اند
فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند   چشمِ ہوش از اسوۂ زہراؓ مبند
تا حُسینؓے شاخِ تو بار آورد
موسمِ پیشیں بگلزار آورد

can put in hard work and are intellectually and morally perfect. Mothers are the preservers of the secret of fraternity. Mothers are the force of the Quran and the nation.

For the women of the world Fatima the daughter of the Prophet is a perfect example. She is dear to us because of three relations. She is the daughter of the Prophet. She is the wife of Ali, the "Lion of God." She is the mother of Imam Husain, the "Leader of the Caravan of Love." The fire of life is due to Imam Husain and he taught us a lesson of freedom. The character of children is after the character of their mothers and consequently Husain acquired all these qualities from his mother.

سیرتِ فرزندہا از اُمّہات   جوہرِ صدق و صفا از اُمّہات

Then Iqbal addresses the Muslim Women of the world as a whole. Your good nature is the strength of our religion and the foundation of our nation. You give the child his first lessons of 'La Illah.' Our thoughts, speech and actions depend on you. In your breath is the fire of the religion of God. Modern age is full of everchanging deceits and of clever tricks. It tries to destroy religion. Its intellect is blind and does not recognize God. Unbecoming persons are leaders in this age. The eye of this age is fearless but does not care about the rights of others. It has got huge powers at its command. Its prey is in fact a prisoner but he believes himself to be free. The person slain by it considers himself to be still alive. O Woman! you are the gardener of the plants of the nation. You are

After many experiences, it produces Khudi and gradually this sense becomes permanent. Many events pass and it creates a national history. A nation develops its attributes to the full by knowing its history and traditions. By knowing its history, it comes to know itself. It ceases to exist as a nation if it forgets its traditions and history.

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو   از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

Connect your past with the present and from this will rise your future. Life is the continuation of national intellect and if you desire to have a life which will not fade in strength then do not sever the past from the present and future.

The existence of a race is due to motherhood. The preservation and respect of motherhood is real Islam. Love of God is born in the lap of a woman. The woman forms the character of a nation.

از امومت پختہ تر تعمیر ما   در خطِ سیمائے او تقدیر ما

'Paradise is under the feet of mothers.' An ugly village girl if she adds one Muslim to the community, who protects his national honour and worships God, is much better than a charming statue of beauty who does not like to bear the pains of motherhood.

ایں گُل از بستانِ ما نارُستہ بہ   داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

In the garden of mothers come into existence the poppy beds of future generations of a nation. The riches of a nation do not lie in money and gold and silver. The real wealth of a nation are healthy and robust sons who

Chapter IV

Rumuz-i-Bekhudi

nation. Centre gives corelation and organization to a nation. Ka'ba is of so great an importance to the Muslim community that it deserves being made the centre. The Jews are not a living force and they are not united because they have got no physical centre.

The real union and strength of a nation lies in adhering steadfastly to the national aim. The national aim of the Muslim nation is preservation and propagation of Tohid. If we have got an aim in view then only we can lead an active, progressive and full life.

مدّعا راز بقاے زندگی . جمع سیماب قواے زندگی

You have got the Quran in your hands, you should be foremost in the field of action. The imagination of man is idol maker as well as idol worshiper. Every age is in search of an idol. Once more the world has instituted a new form of idol worshiping. They have made absolutely a fresh god. This god consists of throne, country and race, who rejoices when blood is shed. In the feet of this unworthy idol mankind is being slain like sheep. O Muslim! you are inspired by the great deeds of Abraham and Muslim dignitaries, strike the sword of "there is nobody except Him" on the head of this falsehood which is in the garb of truth. Show your presence in the darkness of this age and give to everybody the perfect religion which has been bestowed upon you. Otherwise God will enquire from you on the day of judgment.

حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ . پس چرا با دیگراں نسپردۂ

The expansion of national life can be achieved by the conquest of the natural forces of the world. All that is "Except Him" (ماسوا) has been made for you to conquer.

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد عالمے از ذرّۂ تعمیر کرد

The mountain and the desert, the wasteland and the river, the land and the sea, all are subjects of study of persons with insight. The Muslim should make progress in mo-

In the age of degeneration, it is better to follow than to create your own new reasons and paths of life. Modern age is full of evils which are trying to uproot the organization of the old nations. They have made us a stranger from ourselves. Under these conditions it is better to follow the modes and methods of our ancestors so that we may remain united. Preserve what you have, however small it may be instead of throwing it away, in the hope of getting more.

نقش بر دل معنیٔ توحید کن   چارهٔ کارِ خود از تقلید کن

If everyone begins to think and act in his own new way then division and weakness is natural. The wisdom of your ancestors was nearer to the Quran. Know the secrets of religion. Unite yourself by following the Quran.

از یک آئینی مسلماں زندہ است   پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است

National nature achieves to perfection by obeying the 'Laws of God.' Strong conviction in this law is a necessity.

ملت از آئینِ حق گیرد نظام   از نظامِ محکمے خیزد دوام
ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات   شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات

By following the word of God bestowed upon us through the Prophet Mohammad, we become strong and successful in this world. In order to form the highest national character it is necessary to follow the highly praised manners, habits and character of the Prophet Mohammad.

طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است   آب و تابش از یمِ پیغمبر است

For the existence of a nation, it is necessary to have a physical centre, and Ka'ba is the centre of the Muslim

He means by this a prophet. A man dies after sixty or seventy but a hundred years are like the twinkling of the eye for a nation. A man is alive when his body and soul are together, but a nation is alive when it continues to preserve its old honour. A man dies when he breathes his last but a nation dies when it abandons the aim of its life. Although nations die like individuals but the Muslim nation is above the fear of death because God has promised to preserve it.

It is not possible to organize a nation without law, and the Quran is the law of the Muslim community. The words of the Quran have neither been modified nor given a wrong meaning.

رہزناں از حفظِ او رہبر شدند   از کتابے صاحبِ دفتر شدند

O Muslim of the modern times your belief is a slave of the customs. The manners of an unbeliever are your prison. If you desire to live the life of a true Mussalman, you cannot do so except through the Quran. Look at the Sufi. He is intoxicated with the wine of the sweet notes of a singer. He discusses the poetry of 'Iraqi' (عراقی) but not the Quran. Look at the religious preacher. His words are very high sounding but his meaning is very low. He talks of "Khatib" (خطیب) and Dailmi (دیلمی) and of disputed weak points of religion. He does not directly derive from the Quran.

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب   تو ازو کامی کہ می خواہی بیاب

You should read the Quran and solve your problems by means of it.

صورت ماہی بہ بحر آباد شو — یعنی از قید مقام آزاد شو
ہر کہ از قید جہات آزاد شد — چون فلک در شش جہت آباد شد

Homeland is not the foundation of a nation. In this way humanity has been devided into sections and man has been estranged from man. The soul of man has disappeared, humane qualities are gone and nationalities have taken their place. In Europe politics has usurped the place of religion. Christianity lost its power and the Pope became a dead force. Atheism tore off the cloak of religion. Then came a **'Mursal'** (messenger or apostle) from Satan. Machiavelli who was born in Florence in Italy gave a new philosophy of politics to the world. He wrote his book "The Prince," to guide the course of affairs of kings but in this way sowed the seed of strife among mankind. Truth and justice were demolished by him, and he gave to the world a new mode of thinking. His new religion made kingdom as the object of worship. Falsehood has developed by the logic of his philosophy. Artifice, trick and strategem have become an art. He has brought night into the eyes of the world and according to him Fraud is expedience.

The Muslim community is not even bounded by time because God has promised that it will continue to live for ever. Every year, many a flower fade and die never to bloom again but the beauty and ferver of spring remains the same, because other flowers take their place. In the same way individuals die but the community continues to flourish. An individual rises from a handful of dust but a nation rises from the heart of a 'Great Mind'(صاحبدلے).

He illustrates his doctrine of Wisdom and Love by the battle of Karbala between Imam Husain and King Yazid. Freedom died a natural death when the throne of Khilafat (of the Ummiyad dynasty) severed its connections with the Kuran. Imam Husain fought in the field of Karbala for the sake of truth, justice and freedom. He removed repression, injustice and force from this world, up to the day of judgment. He is therefore the foundation of "La illah"—there is no God but one.

Sword is only meant for saving the respect of religion and its object is to preserve religious laws.

رمزِ قرآں از حسینؑ آموختیم   زآتشِ او شعلہ‌ہا اندوختیم
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت   سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ‌اش لرزاں ہنوز   تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

When the Muslim community has got Tohid and Risalat as its fundamentals, it follows that it has got no physical limits; because physical universe does not enter in its formation. Muslims all over the world are one community. The boundaries of countries do not separate or divide them.

مسلم استی دل باقلیمے مبند - گم مشو اندر جہان چون و چند

To solve the problem of the nationality of a Muslim the Prophet migrated from Mecca to Medina. He built the nation on the foundation of Kalima (لا إله إلا الله) and did not enclose it within a physical receptacle : the homeland. Decide to conquer the whole world and migrate anywhere in the world. The face of the whole earth is our mosque.

A nation derives its life from him. A large number of common aims become a large "One" by union. When this unity becomes perfect it becomes a nation. Islam is a natural religion and we have learnt this from the prophet. If this unity is not lost from our hands, we will live up to eternity. So God concluded his "religious law" by creating Islam and He concluded the Prophethood on the Prophet of Islam.

حق تعالیٰ نقش ہر دعویٰ شکست — تا ابد اسلام را شیرازہ بست

The object of the Prophethood of Mohammad is the formation and continuation of, freedom, equality and fraternity among mankind. Mankind had degraded in nature due to slavery. The Prophet Mohammad raised the humble and opened for them chances of expansion and progress.

شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد — کوہکن را پایۂ پرویز داد

زادن او مرگ دنیائے کہن — مرگ آتش خانہ و دیر و شمن

He also removed all differences of status and race, and taught equality to mankind. In the eyes of law as contained in the Quran the king and the slave are equal. They have to obey those laws in the same spirit.

پیش قرآں بندہ و مولا یکے است — بوریا و مسند دیبا یکے است

Now Iqbal proceeds to compare **"Aql** and **Ishq"** (Wisdom and Love). Momin is from love, and love is from him. Love makes the impossibilities of an ordinary person possible.

عقل در پیچاک اسباب و علل — عشق چوگاں باز میدان عمل

عقل را سرمایہ از بیم و شک است — عشق را عزم و یقیں لاینفک است

ملت ما را اساس دیگر است   این اساس اندر دل ما مضمر است

Despair, sorrow and fear are the springs of vices; and these destroy life also. Tohid rectifies the evil effects of these malignant diseases. Hopelessness kills our thoughts and actions. The man dies in spirit while he is alive in body. It is the poison of life. Sorrow saps all the energies of a man. The Mussalman believes in the "Will of God" and on the path of life he is always seen smiling. The force of belief expands human life, the fear of anyone except God is the enemy of action. It stops the mind from thinking and the hand from practical work.

هر شر پنہاں کہ اندر قلب تست   اصل او بیم است اگر بینی درست

لابہ و مکاری و کین و دروغ   این ہمہ از خوف می گیرد فروغ

It shakes our decisive resolutions and throws them into the doubts of possibilities.

A person without courage becomes happy in the company of the unsuccessful. Whoever has understood the meaning of the lesson taught by Mustafa (the Prophet) has found **Shirk** (apostasy) hidden in fear. The fear of God is true belief and the fear of others is apostasy hidden in the heart.

Now he takes prophethood. God created the material body of mankind. By prophethood he poured life in this body.

از رسالت صد ہزار ما یک است   جزو ما از جزو ما لاینفک است

از رسالت در جہاں تکوین ما   از رسالت دین ما آئین ما

life are imperfect as they are. A prophet gives them new life.

تا خدا صاحبدلے پیدا کند　　کو ز حرفے دفترے املا کند

He bestows a treasure on the pauper intellect. He makes the slaves freemen. Then he imposes upon them the law which he has brought. He teaches the individual proper ways of love and the important doctrine of the unity of God.

Then Iqbal proceeds to say that there are two fundamental factors of the nation of Islam: Tohid and Prophethood. Tohid he takes first: it means being one; God is one and also that Muslim community should become one, they should have one aim in view. "Wisdom" he says was without a goal and Tohid supplied it with an aim. Tohid has the capacity of doing great deeds. Some of these he describes in the following words:—

دیں ازو حکمت ازو آئیں ازو　　زور ازو قوت ازو تمکیں ازو

پست اندر سایہ اش گردد بلند　　خاک چوں اکسیر گردد ارجمند

قدرتِ او برگزیند بندہ را　　نوع دیگر آفریند بندہ را

بیم و شک میرد عمل گیرد حیات　　چشم می بیند ضمیر کائنات

"There is one God" is the basic foundation of Islam. Castes, creeds and colours disappear in this one word. The nation should possess one mode of thought, and the fire bestowed by God on man gives this. It is a mistake to construct a nation with homeland and race as its factors. Our nation has got a different foundation: we are bound to the unseen and due to Tohid have all become one.

CHAPTER IV

Rumuz-i-Bekhudi

Now we come to Rumuz-i-Bekhudi the companion volume of Asrar-i-Khudi. To start with Iqbal addresses the Muslim community of the whole world. He says: O Muslim you have forsaken the Law brought by the Prophet. (You should kindle the fire of love in your mind and revive the agreement which you have made with Mohammad.)

An individual should remain united with his nation.

فرد می گیرد ز ملت احترام ملت از افراد می یابد نظام

A person should follow the traditions of his forefathers. His desire of development is because of the nation and the worth of his work is judged by the group. Our aims can only be perfected by help of the forces at the command of a group. You have not distinguished Khudi (Self) from Bekhudi (Selflessness) and have thrown yourself in doubts. There is a Light in you which gives you the sense of individuality.

خویش دار و خویش باز و خویش ساز نازها می پرورد اندر نیاز

By nature it is bound as well as free. It is constantly at war and I have named it Khudi or Life. When it joins a community Khudi breaks itself and from a flower it changes into a flower garden.

A nation is formed by the union of individuals and prophethood is a necessity for the perfection of the training of a nation. The activities of the various systems of

Chapter IV

Rumuz-i-Bekhudi

science and knowledge. Modern world owes a debt of gratitude to us in many spheres of life. Then Iqbal prays to God saying that He should give to the Mussalman a restless heart, a searching spirit and a love which will inspire them.

چشم بیخواب و دل بیتاب ده   بازمارا فطرت سیماب ده

Give us the strength of belief and unite the Muslims all over the world into one body. But Iqbal says, I am alone absorbed in my thoughts and nobody else understands me. O God! either take away back the fire that you have given me or give me a companion who can understand me.

love. I have searched it in vain in Europe. It is a curtain. I have only attained to the heights, by casting aside the chains of European learning.

سوز عشق از دانش حاضر مجوی   کیف حق از جام این کافر مجوی
مدتی محو تگ و دو بوده ام   رازدان دانش نو بوده ام
باغبانان امتحانم کرده اند   محرم این گلستانم کرده اند

The Mussalman has left his own traditions due to the policy of others. He should again produce a pan-Islamic union throughout the world. Time is not continuous like a line and it cannot be measured with days and nights. Time is everlasting. It is pleasure as well as pain.

اصل وقت از گردش خورشید نیست   وقت جاوید است و خور جاوید نیست

Our time which originates from the garden of our soul knows no beginning and no end. The slave is bound down by days and nights. The independent raises himself above the clay and superimposes himself on time.

عبد گردد یاوه در لیل و نهار   در دل حر یاوه گردد روزگار

The soul of the slave is curbed down by the circumstances around him and he cannot conceive anything new. The genius of the independent creates something fresh every moment. The slave explains away his defects by calling them fate. The independent makes fate his councillor and moulds the world.

There were days when we were the ruling force of the world. We were the cause of propagating religion, truth,

علم را برتن زنی مارے بود   علم را بردل زنی یارے بود

Maulavi Rumi used to teach people in his school at Halb. His head was full of wisdom and knowledge but he was unaware of love. One day when he was busy in teaching, heaps of books lay around him Shams-ud-Din Tabraizi according to the commands of Hazrat Kamal-ud-Din Junaidi, went into the 'maktab' of Mulla Jalal. He said, "What is this noise of arguments and induction and deduction." The Maulavi said, "You better get out from here, this philosophy has no concern with you. It is beyond your understanding." The heat of Shams (the word 'Shams' means sun) increased by the words of Mulla, a fire was liberated by the body of Tabraizi. He looked at the ground. A flame came out. The books took fire and were burnt. Maulavi was ignorant of the miracles of love. He said, "How have you produced this fire. It has burnt my books." Tabraizi said, "You are a Muslim with a Brahminal thread. This (ذوق و حال) 'Zauq' and 'Hal' has no concern with you. It is beyond your understanding." Muslims! you have constructed your provisions of life from the snow of knowledge, you should produce a flame of love inside you.

علم مسلم کامل از سوز دل است   معنی اسلام ترک آفل است

(Afil—those bodies in whose nature, it is inherent to deteriorate; heavenly bodies which are going to set).

You have thrown the knowledge of God to the background, and you have sold your religion for a bread. Modern knowledge cannot supply the necessary fire of

five miles from Lahore. Aurangzeb spent a very long period of his old age in conquering the Deccan. He succeeded in it for the moment. He came to Hazrat Mianmir to request for his benedictions of prayer.

مسلم از دنیا سوئے حق رم کند . از دعا تدبیر را محکم کند

The Sheikh remained silent. One of his disciples presented a silver piece to him as offering (نذر). The Sheikh said our king is the poorest among men. He deserves it most. His fire of hunger has burnt the world. In the name of building, he is in fact devastating the world. Mankind is a caravan and he is a highway robber.

از خیالِ خود فریب و فکرِ خام   می کند تاراج را تسخیر نام

By the sword of his hunger, his own armies of the State and of his enemy, both are lying dead. The hunger of a beggar is the fire in his body, but the hunger of a king is the death of country and nation. If a person draws a sword, in the name of anybody except God (غیراللہ) , his sword gets settled in his own breast.

Now the poet describes an advice which Baba-i-Sahrai has given to the Muslims of India. Take care of your Khudi and you will get eternal life. Expansion and domination are a result of the same. You are afraid of death. Well, you have misunderstood the doctrine. As I know it, I will explain it to you. Do not go after others, construct your internal Self. Fly high, and free yourself from the attraction of this earth. If you wish to acquire knowledge, I wish to give you the message of the Pir of Rum (Maulavi Jalal-ud-Din Rumi).

زندگی ہر جائے خود بالیدن است　　از خیابانِ خودی گل چیدن است

Centuries have passed and I am still at my place. I have consistently put in hard efforts and thus collected rubies and diamonds and precious stones inside me. If you are a drop, put on a hard strife with the ocean. Or become a cloud which strikes lightning and rivers flow out of it. Then the ocean will beg for the Storm from you and will consider itself to be less than a wave (compared with you).

From this point Iqbal turns to a different point, a mention to which he had made previously. The object of the life of a Muslim is to raise high the banner of Kalima of Allah (لاالٰہ الااللہ). If 'Jihad' (War in the name of God) is an incentive to the conquest of lands, it is unlawful حرام in the religion of Islam.

طبعِ مسلم از محبت قاہر است　　مسلم ار عاشق نہ باشد کافر است
تابعِ حق دیدنش نادیدنش　　خوردنش نوشیدنش خوابیدنش

A Muslim always follows the code of 'Il Allah'. You should live like a dervish in the garb of a king. Always keep your eyes open and the fear of God in your heart. The aim of all your actions should be 'Nearness to God.'

صلح شر گردد چو مقصود است غیر　　گر خدا باشد غرض جنگ است خیر

If God is not elevated by us, then war becomes unworthy of our nation.

To illustrate this point, he gives the story of Hazrat Mianmir 'wali' whose mausoleum is at a distance of about

He got tired of idol worshipping and gave his thoughts to the worship of one God. Still he could not solve the problem of life and death. One day he went to a Muslim spiritual leader(شیخ) The Sheikh told him you have flown too high and have gone away from your real aim. You are in the skies in search of the diamonds of stars, you should rather come down to the earth and fit yourself into your own circumstances. You are a Brahmin (who does not believe in one God) your thoughts should conform to your own community. You are the trustee of an old civilisation. You should not destroy the culture and religion of your forefathers. If life of a nation depends upon union, then kufr (کفر –unbelief or atheism) is also a source of union. The Muslim Sheikh addressed the Brahmin and said, "You are not perfect in your unbelief, how can you solve the intricate problems which arise in the mind."

ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور   تو ز آذر من ز ابراہیم دور

None of us is perfect in his madness of love. When the flame of Khudi has got extinguished inside the body, no good can come out of those thoughts even, which encompass the skies.

Now under the same heading he gives another story. The river Ganga one day spoke to the Himalyas. God has made you grand and high but you cannot move and life means movement, as a wave exists because of its movement. The mountain said, "Your movement is the cause of destruction for you. A person who forgets himself deserves destruction. You commit suicide by offering your person to the ocean.

Now you wish to save yourself from the ravages of the enemy. I would like to know from you, if you are a diamond or a dew-drop.

چوں ز سوز تشنگی طاقت گداخت   از حیاتِ دیگرے سرمایہ ساخت

And this is the fundamental principle of the battlefield of life, "Survival of the strongest and the fittest." This is achieved by the preservation of Khudi.

غافل از حفظِ خودی یک دم مشو   ریزۂ الماس شو شبنم مشو

Then he relates the story of diamond and coal. In a mine the coal said to the diamond. My respect is less than dust, and you are set in the crown of the king of kings. We both come out of the same mine and the nature of our body is the same. (In fact both coal and diamond are made of the element carbon). You are so lustrious and permanent. My life on the other hand is nothing more than some smoke and some ashes. The diamond replied "Well my friend: dark earth, by firmness becomes a stone for a ring. It fights with itself and then becomes hard like a stone. Your soft nature has dishonoured you.

فارغ از خوف و غم و وسواس باش   پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش
می شود از وے دو عالم مستنیر   ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
در صلابت آبروئے زندگی است   ناتوانی ناکسی ناپختگی است

Then Iqbal relates a third story, in which he states that the continuation of the life of a nation depends on adhering steadfastly to the particular traditions of that nation. A Brahmin who lived in Benares, was a very learned man.

Then Iqbal proceeds to say that you should not be afraid of your enemies. When a person begins to think, he is weak, he actually becomes weak; and the enemy is encouraged to harm him. Why to get angry with friends and why to complain of the foes.

راست می‌گویم عدو هم یار تست   هستی او رونق بازار تست
هر که دانای مقامات خودی است   فضل حق داند اگر دشمن قوی است

The enemy wakes up and excites all the hidden forces in you. A long and tiresome journey is a test of the strong resolution of a person.

مثل حیوان خوردن آسودن چه سود   گر بخود محکم نه‌ بودن چه سود
خویش را چون از خودی محکم کنی   تو اگر خواهی جهان برهم کنی

It is by knowing 'Self' that one gets eternal life. Death is to forget Khudi. Now Iqbal proceeds to illustrate the point under discussion by a number of stories.

The first story related by the poet in favour of Khudi, is of a bird. A certain bird felt very thirsty. He saw a small piece of diamond in a garden. He believed it to be water. The diamond said to him. I am not water. My 'a'b' (the word 'a'b' means water as well as self-respect) breaks the beak of birds. The bird was afflicted with overwhelming grief and the song in his throat became a lamentation. In the meanwhile he saw a drop of dew

قطرهٔ شبنم سرِ شاخِ گلے   تافت مثلِ اشکِ چشمِ بلبلے

The bird went below the branch of the flower and the dew-drop by itself fell into the throat of the bird.

form every moment. If you are wise, then take care that you are not deceived by this enemy who is ever sitting in ambush for you. People do not properly recognize its different forms. They try to hide it by throwing various kinds of curtains on its face. Sometimes weakness is hidden behind the curtain of mercy and politeness. Sometimes it puts on the garb of humbleness. Sometimes it hides itself in forced helplessness and sometimes in incapability. Sometimes because of weakness, a man takes his life easy and thus weakness manages to take away the heart out of the man who possesses power.

On the other hand Truth is a twin of Strength.

زندگی کِشت است حاصل قوت است   شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

If the plaintiff, has got power at his command, then his suit requires no arguments. Falsehood attains the dignity of truth by power. It takes and represents itself as truth because truth has been falsified. Then falsehood because of its power can change poison into water of life and gives the name of Vice to Virtue; and it is accepted by the world as Vice.

O Muslim, you are unaware of the rules and good conduct of امانت (The word 'Amanat means deposit or charge given in trust and also faith and religion). Consider yourself better than both the worlds. Learn the secrets of life. Do not take into consideration anything but God. Suppress all other forces. Here is a programme of life for you. See, hear, speak and then act according to the advice given above and you will be successful in life.

از گل خود آدمے تعمیر کن   آدمے را عالمے تعمیر کن

If you do not make use of your own mental powers then somebody else will make bricks from the clay of your body for his use. Do not complain of the unjust attitude of the world or Time.

در عمل پوشیدۂ مضمون حیات   لذت تخلیق قانون حیات

Rise and be the maker of a new world! It is to admit defeat, if you submit to an unfavourable world. The world conforms to the ideas of the person who is self-respecting and proceeds in the right way. If it does not, the man fights with the world. He pulls out the foundation of the universe and rearranges the particles giving them a new form. He creates a new world with his powers, which is according to his requirements. If one cannot live like a 'Man' in this world, then it is 'Life' to give up life in the strife, fighting like a Man. The man who possesses a heart, tests his powers by tackling huge problems. The possibilities of the powers of the men of action become apparent by "Desire of the Difficult" (مشکل پسندی). Malice is the implement of the people without courage. Life is energy which always keeps generating. Its origin is the pleasure which a man takes in predominance and conquest.

عفو بیجا سردیٔ خون حیات   سکتۂ در بیت موزون حیات

Whoever has remained in the low state of subordination has considered weakness as contentment and peace of mind. Weakness is the highway robber of life. Its domain is full of fears and lies. Weakness is destitute of nobility and respectibility. It breeds vices. It changes

The third stage in the process of the development of Khudi is the viceregency of God. It is good to be the 'Deputy of God' in this world and to rule the physical forces. The Deputy of God is like soul in the body of the wolrd and he knows all the secrets of the parts or of the whole. Self-expression is in his nature, and he thinks out many ways of doing so. For example

پختہ سازد فطرت ہر خام را   از حرم بیروں کند اصنام را

He teaches old age the activities of young men. He makes researches in Arts, Literature and Sciences. By "Action" he gives new life to the world. He gives a new explanation of the activities of this life. He is the secret of life and brings into existence things which the world does not know. But the Muslim community is waiting for such a man.

اے خفتہ در خاکستر امروزِ ما   شعلۂ فردائے عالم سوزِ ما

We are waiting for this person, who in some future time will suppress the tumult between various nations. Iqbal in his poetic way, requests this new leader of Islam. Come, and give a practical shape to the law of Fraternity, and Love. Bring peace to the world. You are the goal of the caravan of life. We have become weak and degraded. We will again become dominant and will conquer the world through your personality.

Ali, the son-in-law of the Prophet was a man of many qualities. He gave fresh vigour to Faith, and brought honours to the community of the faithful. He developed self-discipline and killed concupiscence (هوس). A person who knows himself and controls himself, he rules the world.

orders the unworthy become worthy. It is by obedience to laws and regulations that we can conquer the moon and the milky path. By the law of unity the drops form an ocean and the particles of sand form the desert. Do not complain of the strictness of law, and do not go out of the bounds prescribed by the Prophet Mohammad.

Control of Self by controlling desires is an absolute necessity.

ہرکہ برخود نیست فرمانش رواں   می شود فرماں پذیر از دیگراں

In the nature of man fear has been mixed with love. Fear is of many types: fear of this world, of the other world, of life, of afflictions, of earth and sky. Love covers many fields: property, money, mother country, relatives and wife. As long as the staff of 'Lā Illah' (there is no God but one) is in your hands, you can break down all spells of fear. When a person follows justice according to the dictates of God, his head is never bent before falsehood. He is not afraid of anybody except God. He breaks off all relations except those with God. 'Lā Illah' is the mother of pears (shell) inside which the pearl of Nimaz (prayer) is contained. It kills evils and unbelief. Haj polishes the nature of a Muslim. It teaches migration(هجرت) and annihilates the love of country. Obedience is the capital in trade of a nation. It binds them together Zakat (زکوٰۃ—alms) kills the love of money. It also teaches equality. It teaches to spend what we love so that we may reap good in return. All these are the causes of your strength. You are strong, if your Islam is firm.

concern with truth. His breaths extinguish the fire of our heart. Save yourself from the ideas of such a poet and do not follow him.

O Mussalman, the literature produced by such poets has degenerated and degraded thee. You have eaten deadly poison administered by him through your ears.

Love has been dishonoured by your lamentations and your coldness has taken away the burning (سوز) from its fire.

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد　　در حرم زائید و در بتخانہ مُرد

Now the best way for the Mussalman would be to test the literature which he possesses with the standard of success or failure in life. Clear thinking is the leader of action. Literature should contain fit and chaste thoughts, and a constant reference to the Prophet. Now warm yourself with the heat taken from the desert of Arabia. You have become weak and languid by taking life easy. Now make a habit of wearing the hard hand woven cloth (کرباس) instead of soft silk. Become hard, try hard, exert yourself and have a very high aim before you. Then in the battle of life, you will come out successful.

Khudi can be developed by passing through three stages: (1) Obedience, (2) Control of Desires and (3) Office of the Deputy of God.

We should do our duties faithfully. Be obedient because freedom is born out of compulsion. By obeying

on the mind of the Sufi. Many a nation have been poisoned by his intoxication. They went to sleep and were deprived of the 'Delight of Action.'

Now Iqbal takes up an issue which touches on this subject and describes the virtues and defects of poets and poetry. He discusses the improvements which can be effected in Muslim Literature. Man is warm in thoughts and action because of desire.

از تمنا مے بجام آمد حیات　　گرم خیز و تیز گام آمد حیات

Life is the object of our conquest and desire is the spell by which we can conquer it. Anything which is good and suitable and beautiful, we wish to have for ourselves. A thing of beauty is a joy for ever. (Tennyson).

A poet can make us look a good thing better. His words enter into the mind of people and he is the creator of thoughts which people believe are their own. In the words of the poet is water of life (آب حیات). Our task is still unfinished and Islam is still marching on the road of progress towards its goal. Poet wakes up a nation and invites them towards action. He urges them to consider their present condition and to produce a desire of progress in their heart.

That nation is very unlucky whose poets take it away from practical life.

He depicts every vice as virtue. By the charm of his words the weak become still weaker. His beauty has no

Iqbal now brings forth a novel argument regarding the propagation of the doctrine of self-negation or self-denial. He says that the conquered weak nations by this secret method, weaken the character of the dominant nation. It is one of their implements of war against the strong. As they cannot attain to the high level of the strength of the conquerer, they arrange to make him morally weak in this way. They describe to the conquerer the virtues of restraint, harmlessness and killing of internal desires. In this way the dominant race loses its staunch resolution to put in hard efforts, and the desire of action vanishes from its heart. It loses its character, resolution and high position; with it respect, prestige and sovereignty are also lost. One hundred mental diseases are produced by loss of strength, like diminution of the sphere of action, loss of spirits, low character. In this way the superior nation gets intoxicated in a dreamland and loses its virtues. It names its deterioration, culture and civilization.

Iqbal then proceeds to say that Plato in his philosophy has propounded this doctrine of self-negation. His philosophy has effected the literature and mysticism of early Islam to a great extent. But we should save ourselves from his ideas as they are against the laws of progress. Plato says that the secret of life lies in death. His philosophy takes us away from life and we begin to feel drowsy. His arguments are highly developed, but the purport of it is that the world of causes is a fable.

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت   حکمت او بود را نابود گفت

He refuses to accept the importance of practical life and of the zeal for action. His doctrine strongly prevails

are the lovers of the Prophet. He removed all differences of caste, creed and colour.

چون گل صد برگ ما را بو یکیست　　اوست جان این نظام و او یکیست

Iqbal says, I am a lover of the Prophet and follow him in all ways.

Love produces many virtues and one of them is to "follow" and obey the words of the beloved.

عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار　　تا کمند تو شود یزداں شکار

The Muslims should make themselves strong by dint of the love of the Prophet.

Khudi deteriorates by requesting and begging. Our requests to others, kill our flight of imagination.

تا بکے دریوزۂ منصب کنی　　صورت طفلاں زنے مرکب کنی
فطرتے کو بر فلک بندد نظر　　پست می گردد ز احسان دگر

You should earn your livelihood by your own hard labour, so that on the day of Judgment, you may not feel ashamed before the Prophet. Pray for your strength to God and do not demolish the honour of the Muslim nation by making requests to others. The Artisan is مصب الہ, the friend of God.

When Khudi becomes firm by love it conquers the hidden and apparent forces of the universe.

از محبت چوں خودی محکم شود　　قوتش فرمانده عالم شود

Then Khudi in the strife of the world becomes an umpire (arbitrator). Kings like Dara and Jamshaid are under its commands.

The object of research is not just to acquire knowledge, nor of garden the roses. Knowledge and arts are some of those factors which protect life and strengthen Khudi.

Khudi develops and becomes stronger by love. Khudi is the spark hidden inside the dust of which we are made. Love is the cause of its excitement and provides it with an incitement. It is the cause of the development of the hidden possibilities of Khudi.

Learn how to love. For this purpose follow some spiritual leader. Like Rumi, light the candle of your heart, by becoming the disciple of some Shams Tabraizi. There is a beloved hidden inside your heart. Come along! I will show it to you, if you have got the eye to see it. His lovers are better than the beloveds and heart gains strength through his love. The dust rises to the skies. He is the Prophet of God Mohammad.

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است   آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

He lived in retirement in the cave of Hira and created Nation, Laws and government. He passed many sleepless nights so that the nation may sleep on a throne. In the battlefield his sword used to cut through iron but tears flowed out of his eyes when in prayers before God. He gave a new system of laws to the world. He opened the door of the world by the key of religion. He is our leader and protector.

We, the Muslims are not prisoners inside a geographical receptacle. The whole of the world is our home. We

It divides its flame into parts and teaches wisdom to worship 'Parts' (and not the object as a whole). Then the Part|s get tired of the division and they unite together to form a mountain.

وانمودن خویش را خوے خودی است   خفتہ در ہر ذرہ نیروے خودی است

Khudi is a silent force, which is restless for action, and it works through the causes and reasons of the practical world. The wave, as long as it is a wave, due to the inspiration of Khudi, rides on the shoulder of the ocean; otherwise it becomes water and goes down. The courage of the green growth, when it receives the inspiration from inside to grow, due to Khudi, tears open the chest of the garden. When Khudi unites together the forces of life, it can draw out an ocean from the stream of life.

Khudi can only remain alive when we create and provide it with aims and objects: some Motive to fulfil. Life is hidden in desire and search.

آرزو را در دل خود زندہ دار   تا نگردد مشت خاک تو مزار

Desire gives full vigour of action to Khudi and life dies if desire dies inside it.

زندگی سرمایہ دار از آرزوست   عقل از زائیدگان بطن اوست

Khudi assumes many forms in practical life: organization of a nation, laws, customs, researches in various branches of knowledge. In the battlefield of life, man makes all these instruments for his own protection.

For this reason I have raised the curtain from the face of Khudi and I have disclosed the secrets of the miracles of Khudi. I have explained how the Muslim nation can continue to live and develop. I will make a drop equal in strength to an ocean and a particle will grow till it becomes a desert.

My object in writing this Mathnawi has not been to impress my poetic powers.

شاعری زین مثنوی مقصود نیست ، بت پرستی بت گری مقصود نیست

I am an Indian and therefore it will not be possible for me to write elegant Persian. But I have selected this language as the vehicle of my thought because it agrees with the nature of my philosophy.

خردہ بر مینا مگیر اے ہوش مند   دل بذوق خردۂ مینا بہ بند

You should benefit from the meanings of the discussion in this book.

Now begins the original book. Iqbal says that the basis of the orderliness of universe is Khudi. The continuation of the existence of the individuality of objects is due to the firmness of Khudi.

پیکر ہستی ز آثار خودی است   ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است

Khudi inspires the object with the idea of its distinct individuality and in this way sows the seed of strife. It brings forth excuses of higher values, civilization and culture, to demolish a whole garden in order to beautify its one rose. The whole universe and time from the beginning to the end of universe is the field of action of Khudi.

ideas in the world, which nobody else has discussed before. But people in general are not as yet aware of my philosophy. I am poet of the future."

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم   من نوائے شاعر فرداستم

The poets change the ideas of people but they must take time to do so, i.e., till their works are widely read and their philosophy is known to people.

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد   چشم خود بربست و چشم ما کشاد

I am a lover and my lamentation is 'Belief.' There are many lightnings sleeping in my mind. The whole world is my field of action. And you know what I have done:—

ذرہ از سوز نوایم زندہ گشت   پر گشود و کرمک تابندہ گشت

Nobody else has revealed those secrets which I describe. If you want to know the secret of everlasting joy, if you want the earth and the sky, then 'come to me'. The aged heavens has told me this secret and I do not wish to hide it from my intimate friends.

I will lead the astray towards their goal. I will again recite from the great philosophy of Maulana Rum.

پیر رومی خاک را اکسیر کرد   از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

Iqbal says that Rumi came to me in a dream and instructed me to propagate my philosophy in the world. Give a message, he said, to the nations of the world, and bring them to life again.

خیز و جان نو بدہ ہر زندہ را   از قم خود زندہ تر کن زندہ را

of selection of these verses was made up of some factor, which may be given here for your information before we proceed further. This will give the reader an idea why these very verses and not others have been selected. (1) The verse was of a high standard from the poetic point of view and in order to show the poetic powers of Iqbal it was selected. The study of these will delight the intelligent reader. (2) The verse was pithy and covered a vast ground of meaning. Hence instead of translating it, it became necessary to give the original. (3) To illustrate the point of view of Iqbal, one or two verses from each argument were inserted.

I have also to apologize for the language used in this exposition of Iqbal's philosophy at certain places. The idea is to study Iqbal. We can understand him more thoroughly the closer we remain to his original words. I have therefore not tried to use elegant English idiom at the expense of the force or meaning of the true ideas of Iqbal. As far as possible, all through the narrative I have translated the verses of Iqbal keeping in tact the force, idiom and similies of the original text. Under these circumstances, English cannot be idiomatic or sweat. It may also be stated that the original verses quoted have not been included or translated in my text. The ideas contained in them are extra. The reader is expected to translate these for himself and to know their meaning. The text of the monograph without these even is continuous. We revert now to the book Asrar-i-Khudi.

The poet in the Introduction gives his own powers of thought and pen. He says, "I have brought forth those

CHAPTER III

Asrar-i-Khudi

[The original verses quoted in this discussion have not been translated, nor their meaning included in the matter written by me. These quotations were supposed to be necessary for the sake of illustration and corroboration. The original idea was to give their English translation below them. Now for lack of time and space in printing, they have been allowed to remain as they are. The reader is supposed to understand them himself. The narrative however is continuous without taking them into consideration.]

The best way to understand the doctrine of Khudi of Iqbal would be to study his two works, Asrar-i-Khudi and Rumuz-i-Bekhudi which deal on the subject. Let us pass through these books from one end to the other and find out what the gist of his philosophy is. After we have understood the main features of the theme, it will be possible for us to analyse the arguments and to co-relate one set of reasons with the other. We will thus be in a position to make a systematic study of the subject.

In the beginning of the book 'Asrar' the poet writes a "Tamhid," which is more of an 'Introduction' than a 'Preface.' It seems necessary to give the cause and purpose which incited the poet to write the book. He says:—

باغباں زور کلامم آزمود   مصرعے کارید و شمشیرے درود

In this review of the two Mathnawies, I have quoted some original verses in the discussion. The criterion

Chapter III

Asrar-i-Khudi

the same philosophy in one form or another. Khudi (Personality) with Iqbal is not a metaphysical speculation. He propounds this philosophy with the conviction of a prophet and invites the people to follow this doctrine. He finds a sorrowful and drowsy multitude of nations around him in the East. He wishes to wake them up and then to goad them towards action. This he says is possible through the development of Self: Personality which he names Khudi. When the individual is developed, the group or the community will attain a higher standard of thought and action automatically as the group is constituted of individuals.

right into the heart. It is however static and comes to the reader in a sleepy mystic form. It sets up strong currents in his ideas but does not produce a storm in his actions. It collects the gunpowder but the matchstick is missing. It is charged with heavy electric current but the switch and the switch-puller are absent. This Iqbal purposely did not supply because of the political circumstances. He did not like to go to jail. He would have been called a revolutionary and would have missed the chance of propagating his message. Being in close touch with him, I have heard from his tongue a round about explanation of the same type. "The Government has bestowed upon me the title of 'Sir' and do they believe I am afraid of them." In his heart he was not, but in his actions he was. For this reason in his earlier days of poetic activity he clothed the stronger revolutionary ideas in Persian—a language not much understood by the average man and above the criticism of the reporting policeman.

We have discussed above the basic metaphors and ideas which occur in Iqbal's works over and over again. These are the colours with which he paints his picture or factors which constitute his narrative. Now let us see his main theme of the philosophy of life. Iqbal urges that man should develop his Personality or Ego (Khudi) and thus attain to the status of a Perfect Man (Insan-i-Ka'mil). Asrar-i-Khudi (published in 1915) and Rumuz-i-Bekhudi are the two most important works published early in his poetic career. The poet develops in these two books his main philosophy of life and discusses it in some detail. Other works which followed contain portions or touches of

take care to improve the world around him. Deterioration thus sets in due to neglect and progress of the community is hindered. Iqbal calls it against the dictates of Islam, which by nature is a progressive religion. Hence according to him this type of Sufi doctrines are free thought even Rationalism.[1] Iqbal throughout his works, with this conviction in view, wages a constant war against such Sufi ideals. With the same ideas in view he condemns the modern **Pirs** and **Gadi-nasheens** of Dargahs. He calls them ignorant and blind; unfit to lead the masses on the right path. Sometimes he says, they are selling graves. Again he points out that these are pious shops where business of fraud in human souls is carried out.

Iqbal preaches modernism in action and progress, but he was born in that India when thick clouds of conservatism still covered the atmosphere. He could not shake off that old mode of thought. As regards Woman and Education he writes (Dharb-i-Kalim, p. 95). It is doubtful whether this combination of modernism and conservatism can remain on friendly terms with one another on the road of progress. Probably he did not like to preach directly against the old type mulla. Being in near touch with the Anjuman Himayat-i-Islam, (he was its President for some years also) he did not like to say directly against the accepted practices of Islam as current in India although they may have been deteriorated in some forms.

Iqbal preached revolution of the extreme type for the individual and for society. His diction is full of vigour, his ideas explicit and his narrative full of charm. It goes

(1) Reconstruction of Religious thought, p. 211, 1930 edition.

aspects of human activities: social, economic, personal or political. He preached that the battles of life are fought with the aid of Firm Conviction, Consistent Action and Unceasing Love.

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم   جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

To attain power develop Force, Courage and Personality. He gives a sermon of adaptation, change and swiftness to the lethargic world around him. He says life is a constant struggle—an everwidening assimilative movement. It is Tension which makes us immortal. We should maintain this tension as Personality means tension. We should not be absorbed in the surrounding but should absorb the whole world in us. He hates timidity and apathy. Practical achievement has got great value with him.

He does not agree with the Sufi ideal فنافی اللہ to be lost in God. He wishes to develop Personality or Ego. He does not like to demolish Self. For preaching this ideal he denounces Hafiz and Sa'di. It is a curious fact that he uses the same implements which he denounces. He writes with the emotion, in the language and possesses the charming sweatness of a mystic: the tone, the spirit is mystical.

Iqbal admits that Sufi Jalal-ud-Din Rumi is his guide and leader in thought, but he declares with vehemence that Sufi philosophy of inertness and aloofness from this world is sapping the strength of Islam. The Sufi ascetic is so occupied with the thoughts of the other-world, that he does not

civilization he believes has served the purpose for which it came into existence. It has become deteriorated by eliminating religion. It will wage a war against itself and thus will be annihilated. Iqbal's views regarding social, political and economic life of Europe are tainted by these undercurrents of thought. Due to political reasons perhaps, the young generation of India created such thoughts in their minds. This was one solution of the problem how India and East could free themselves from European aggression. Some of the European philosophers expressed the same views before him and propounded reasons to prove that European nations will fight among themselves and European civilization will perish. Iqbal takes delight in repeatedly dilating on the subject. However there is another section of critics in the East and West, who lead the majority: they are quite optimistic about the future of European civilization. It is a curious fact that those very creative minds who have drunk deepest at the fountain head of European civilization have turned round to become its bitterest critics. This fact is regarded by some as a proof to the conclusion that European civilization has deteriorated. It cannot continue to survive in the hard trials of practical life, with those basic principles on which it stands at present.

As regards the development, progress and perfection of a person or of a community Iqbal has developed a philosophy of his own which may be called Iqbalism. His standards of judgment rest on the principles of Islam but not in that form as they have been expounded by the savants of Islam, ancient or modern. Iqbal has formulated his own philosophy regarding the various

modern philosophy as a student. He does not agree with its conclusions. He rather fiercely criticises it and rejects its proofs. He denounces the philosophy of Plato as harmful to the development of Self and Community. Nietzche and Karl Marx are taken as representatives of the Western material world, which Iqbal does not like.

Islam, he says, is non-racial, non-national in spirit : a common brotherhood of mankind whose sphere extends from pole to pole. It does not allow imperialism and materialism; it develops society on democratic basis. Europe on the other hand has based its civilization on imperialism and materialism. In the eyes of Iqbal the democratic countries of modern Europe are in fact autocracies. The power is in the hands of the few and the same corruptions which are the result of autocracy prevail in these lands. He illustrates the mentality of Europe by referring to great personalities of Europe like Kitchner, and describes the Islamic ideal by referring to Eastern names like Jamal-ud-Din Afghani, etc. He has stamped many titles and phrases, which appear more or less as slogans throughout his works. A word means a certain process or action or phenomenon: 'Khawja (capitalist), Banda or Mazdur (labourer) ; 'Sha'hin' (ruler or aggressor), 'Kabutar' or—(the ruled or down trodden). Iqbal expresses his views by making use of terms like, Outer Good, Inward Eye, Capitalism, Socialism, Freedom, Slavery, Imperialism, etc. The League of Nations according to him is a farce: an assembly of grave-cloth thieves.

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُزدے چند　　بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

The League in fact has not achieved much of practical value. It is a model of idealistic futility. European

Hali published his **Musaddas** in 1879 (about the death of Ghalib). He was associated with Sir Sayyed Ahmad Khan the founder of the Aligarh movement. He flourished in a period when Western thought had found a landing in the Indian soil. It gave promise of worldly gain and cultural attainment. Western education was a channel through which government posts could be obtained and thus political power regained. Hali reviewed the Muslim past and argued that tendencies of progress and change were an inherent factor Muslim civilization. He appealed to the people to march with the time and to adopt themselves to the new circumstances. People respected his words because they found him to be the spirit of the age.

The most active period of Iqbal's mental laboratory can be placed between 1910 and 1935. His famous Persian work Asrar-i-Khudi [Secrets of the Self (or the Ego)] appeared in 1915. When Iqbal's mind became active, it found an atmosphere in which Western Ideas had overpowered the Eastern thought. India had taken an overdose. The weak points of Western civilization became clear. Everywhere in India there were movements to harmonize and stabilize Indian thought. They wanted to go back to Indian culture. Indian music, painting, dancing and manners, all were revived. Iqbal was a scholar of Islam. His mind was full of Islamic learning and traditions. We make use of the store of knowledge at our command when expressing ourselves. So did Iqbal. His source of inspiration is the Quran and Hadith. He frequently draws from the cultural and literary traditions of Islam. But Iqbal only refers to the traditions of the most vigorous days. With this Iqbal had learnt

of the whole Muslim East. By writing in Persian the message can reach all the Muslim lands. Once we three young men forwarded reason after reason in favour of Urdu. This was in the later years of life: the last period of sickness about five years before his death. The poet partly due to his conviction of success and partly due to sickness had become sensitive. When Doctor Sahib, as we used to call him found that the reasons advanced were sufficiently strong, he stopped us by saying, "I have got my own ideas and they have been known to the world in a certain shape. Now I cannot change them."

Now let us, for a moment, analyse the development of thought in Muslim circles, through the literary productions of the three poets mentioned above: Ghalib, Hali and Iqbal. Ghalib witnessed the mutiny, the change of political power from the Muslim to the British rulers. He saw the disastrous sequel of the political revolution. He lamented the social changes. He himself suffered in this period of rowdiness. His writings reflect the image of the happenings which took place in his days. Despair, no confidence, vanquished hopes are hidden in the words which fall from his pen but he adds a dominant note to all these. It is a note of warning and hope. He interpretted the inner revolution by saying that we should change if time has changed. He said now our hopes lie in the future and we should help ourselves; this was inherently included in the song of despair which Ghalib sang. The Aligarh educational movement came into existence. This trained the thoughts of Indian Muslims on the lines of the modern ideas—the ideas which emanated from the West. Thus a new current started in Muslim literature: prose and poetry.

European methods very well. He was in touch with the literary and psychological changes of the modern world. But he refused to make use of all this knowledge in the main part of his works. At the end of his life he produced some Urdu pieces which incorporated these features, probably under constant pressure of his admiring circle of literary friends. The volume is small and old age combined with weak health of that period did not allow the poet to put the fire of his previous days in it. Iqbal's style of Urdu poetry served as a model for certain young poets between 1910 and 1930, when the **Shikwa** of the living poet was sounding in everybody's ear. The zeal died because this style did not cover all the fields and was rather small in volume.

His Persian style is based on medieval classical poetry of Persian. The greatest mystic poet Jalal-ud-Din Rumi, whose **Mathnawi** is a treasure of Persian literature, in fact a bright gem in the literature of the world, is his teacher. Iqbal says himself:—

پیر رومی خاک را اکسیر کرد - از غبارم جلوه ها تعمیر کرد
من که مستی هاز صہبایش کنم - زندگانی از نفسہایش کنم

Thus he adheres in conventions and style to the poets of the medieval period. Modern Persian scholars are trying to get over this style and they have already placed in the literary field an idiom which is at once forceful, precise and bright.

I very well remember three occasions on which chance arose of discussing this point with 'Ustad' during the talk. He refused to admit the arguments forwarded saying that his message was not meant for India alone. It was meant for the whole Islamic World and Persian is lingua franca

write to-day. He was not a man of the age in which he lived. His foresight belonged to the future age and through his prophetic genius he could judge what trend the literary thought of world would take. His Urdu poetry served and still serves as a model for many young poets of India. Hali wrote in Urdu as well as Persian, but Urdu was his main vehicle of thought: the language which people could understand. He wanted to convey a message to the Muslim masses and that he could do in Urdu: their language. Iqbal wrote in Urdu and Persian but his most important works are in Persian. His fame will rest on his Persian productions rather than on his Urdu poetry. According to some estimates Iqbal missed a great opportunity. He should have devoted greater energies to Urdu. He had the gift and the requisite intellectual powers and material at his command but he did not direct his powers towards that aim. His message would have been more widespread in India, his genius more understood and appreciated, and with his message of life he could inspire the Urdu reading public of India with a new style or a modern social order. Iqbal could have carried the modernization of Urdu a step farther. He could enlarge the outlook of Urdu readers and could fill their hearts with tendencies which would be useful in future. But Iqbal did not do it. He talked in mystic language of the medieval ages. He gave a message but the spirit of the message always remained mystic. Iqbal was a genius of varied interests. Having been in his company for many years, I know he was a well-read man. He had varied interests and could talk with confidence on many subjects. In Islamics he was an authority. He had seen the world. He got his education in Europe and knew

CHAPTER II

Iqbal's Place in Space

Iqbal was born at Sialkot in 1876 and died at Lahore in April 1938. He l.ved in a period when Indian Muslims had ceased to be the dominant factor in Indian politics after the mutiny of 1857. The archaeological monuments of the Muslim Period, however, were still numerous and the memories of the glorious deeds of Muslim conquerers were still fresh. The period of decadence of Muslim thought and creative genius in India, began with their political decline about a century and a half before Iqbal's time.

It will be worthwhile taking the group of three great Muslim poets of India as a whole, who are responsible for moulding into shape the poetic thought of Muslim India as we find it to-day; I mean 1. Ghalib, 2. Hali and 3. Iqbal. All three wrote in Persian and Urdu. The larger portion of Ghalib's intellectual creations is in Persian and he takes pride in it.

فارسی را بیں کہ ارژنگ من است   آنچہ فخر تست او ننگ من است

The couplet is directed against Dhauq, the Ustad of the last Mughal Emperor Bahadur Shah who wrote in Urdu only. By the word A'nchih is meant Urdu, the medium in which you (Dhauq) write. But in the days of Ghalib Persian still held the exalted position of being the court language and the language of the higher circles of India. His fame to-day, however, rests on his Urdu works. He is the inventor of the chislled style of Urdu prose in which we

*

Chapter II

Iqbal's Place in Space

*

and partly due to love for the great 'Ustad', the pen wrote and wrote unconsciously. And this is what has become of it. The monograph deals with the two books of Iqbal Asrar-i-Khudi and Rumuz-i-Bekhudi, which mainly cover the philosophy of life as propounded by Iqbal. There are touches and headings in other works from his pen also, but I had no time to pass through and to refer to them. I have dealt with these two books only.

In the beginning I have to apologise for one drawback in this monograph. As explained already I started with the idea of writing a short article. In the beginning of Asrar I explained the matter in a pithy form. As I proceeded the explanations unconsciously became fuller and expanded. At the end I found that the first part of the discussion was unproportionately small compared with the last. So I sat down to work again and rewrote the first 74 pages of Asrar to make the whole matter more proportionate. But now I found that these 74 pages had been more extensively dealt with, compared with the rest of the discussion. I had no time and energy to rewrite the latter portion just at the moment. So I have allowed it to remain as it was. I think the unproportionate space allotted to the first and latter part of the discussion in this monograph will not be very jarring. However it will not be difficult to set it right at some later time.

We leave it at present as it is, for insertion in the "Iqbal Number" of the OASIS. But it is not over. We are waiting for some more suitable opportunity when engagements and energies permit us to complete it and to discuss it in a fuller and more detailed form.

guru, watching me with his sweat smiling gaze from his heights in heaven, will not mind it. His lips w'll slightly open, just as a bud opens to become a fully bloomed rose, his eyes will sparkle as they did in the moments of intellectual ecstasy and he would say, "What! this word, I do not like it, O! but it is you Qalandar Sahib, alright a special permission for you." It is not possible for anybody to forget Iqbal, if he has seen real Iqbal; I mean not his material body but the poet and thinker inside him. He was such a charming friend. Even with juniors he would talk politely and behave in a free and friendly way. He would relate incidents from his early life, life in Europe, incidents during tours and meeting with learned men of the world. When in privacy, and he knew that he was not being overheard, he would relate anecdotes of his young days, funny stories that he had heard, Persian and Arab:c idioms and anecdotes full of pleasure and fun.

After his death, I collected material to write 'something' on Iqbal; I did not know myself exactly what. All the relevant matter was with me and Mr. Shahid knew that it was. He also knew my relations with Iqbal and with the learning of Iqbal. He pressed and pressed me for writing an article for the coming 'Iqbal Number' of the College Magazine. After all I asked him 'On what'. He said "Anything; anything suitable, perhaps philosophy of Iqbal would be suitable."

I started writing with the intention that it will be a short article. As I proceeded the matter unconsc:ously expanded. Partly due to my study of the subject, partly due to the extensive knowledge about the poet and his poetry

the philosopher, the poet, the thinker, who could pierce through the skies and reach the throne of God, who could go down in the depth of the deep seas and calculate the treasures which they contained, who could go forwards into space: probe through the darkness of future and describe what the destiny has got in store for us. Then he was real Iqbal. This was on limited occasions, when proper atmosphere was created for such a huge personality to come out of its material garb and to shed the radiance of its presence on those who were present.

Iqbal disliked being called an 'Ustad.' He never accepted the high honour of becoming the 'Ustad' in poetry of any person. He was accepted as a poet of high talents and high merits. Many persons, rich and poor, men and women wrote to him or requested him to correct their pieces of poetry but he never accepted this Ustadship. He was above the trifles of life. He called himself like myself a Qalandar and Darvish. To me he sometimes in a jocular mood would say, "Hullo! Qalandar Sahib, you have come." This meant that I had come to Lahore, because I lived at Bahawalpur and did not get many chances of going to Lahore. In my letters I wrote to him sometime, "Qalandar Munimi wishes to write to you thus..." He got those words and liked to repeat them.

It was unfortunate that we could not meet very often. I lived at Bahawalpur and could see Iqbal only when I went to Lahore. During the period which extends between my coming back from Persia and the finishing of my research work for thesis the meetings were sufficiently frequent. Research work, study and business took me to Lahore and then I must see the 'Ustad.' I believe now the kind hearted

days he was a huge reader also and in later life he used to hear. I helped Iqbal in certain ways regarding the study and collection of material in some of his literary activities. When I was there, it is clear that a part of such work, in his literary company, would fall to the lot of the literary companions. In very hot weather you would find him in a plain white loin cloth and a banyan. He wanted to remain simple. No stranger would say he is that storehouse of learning and storm of fire which has given a new soul to the Muslim East. If you talk to him, you would find him very simple in talk also. He used to talk to people according to their intellects and capacities and nobody can exactly judge the capacity of an unknown man from his face. More often than not, Iqbal used to talk in Panjabi. When he talked in other languages, English or Urdu, it was easy to discern Panjabi accent in his speech. Many visitors came to see him from far and near. It was possible for him to sit silent for long periods, when a stranger sat watching him. He did not know what to talk to the man and would remain silent until the other man talked. It was only in a discussion or in the fight of arguments that you could see real Iqbal. Otherwise under the ordinary circumstances, he was an ordinary person: jolly, ready with an appropriate joke and accommodating in a friendly mood. He was slow in movement and inactive in habits. But at the time of mental ecstasy he would throw off his lethargy, body and limbs seemed to be full of energy and fire. His face would sometimes be flushed with red rose blood, his small bluish eyes would begin to sparkle and one would feel that he is not the same man with whom he was talking sometime ago. During moments of mental excitement and intellectual exertion, he became active, his face became slightly stiffer, his eyes shone and he seemed to be full of vigour. Then he became,

spoils the beauty of poetry and if I give the meaning from my tongue the meaning becomes specific." But my case was different. The common ground of meeting was loved by both of us and was indivisible. Then it was a lively literary discussion which followed and Iqbal always liked it. The higher the flight of thought, the more difficult and complicated the arguments, the more happy he was. Then he became real Iqbal. He soared high and dived deep. He always brought forth arguments from the earth, from the sky, from religion, from monotheism or atheism, physics or metaphysics, history or philosophy. It was not possible to beat him, if even you go prepared and ready with well thought out arguments and well planned line of action. He knew from the first part of the argument what you are driving at in the second part of it. When you have given out your second argument, he conceived your line of thought. He would change your line of thought in the second argument and by force of logic would refuse to go back to it. You did not know what to do because your head is full of a certain philosophy which you have already prepared. Iqbal himself did not get in those days many such chances of real intellectual pleasure, so unconsciously he started the discussion and during the discourse points of his philosophy were being solved. I mean, this gave me an insight regarding his ideas on various subjects which he had discussed in his works. O my God! he was a tower of intellect, a genius of the first order, a man with a very strong memory, a quick-witted person with such a vast store of learning in his head; that we could easily call him a moving library. He could open any of the almiras of the various subjects which he commanded and give as much as the enquirer could withstand. But in his

more often than we could meet otherwise. Then our friendship, or if you prefer to call it relation of teacher and student, was purely literary; because that was our common ground. The moment we were together the talk reverted to literary and learned subjects instead of household or social or political affairs. Iqbal by that time had finished a large part of his literary productions. His ideas were set and he knew what he had done and what he meant by that. I was also at that time a professor in the college with developed intellect. With the knowledge and languages at my command it was quite easy to understand Iqbal. We sometimes had a lively discussion on the points discussed by him in his works. The apparent object of our meeting on a certain day; the discussion of some part of my research work or his future programme was over. We sat in a leisurely mood. I would recite a couplet from some modern Persian poet and then a verse or two from Iqbal. I purposely gave some ideas which would touch on the subject but were not of Iqbal. Iqbal refuted them and gave his exact ideas and what he meant by them. In this way gradually I passed through the spirit of his philosophy, having received it directly from the fountain head. But Iqbal was a very sensitive man on this point. He would answer no such questions directly. If anybody would put a direct question, "Doctor Sahib, (that is how we used to address him) what is the exact idea or meaning behind this verse of yours." Hundred per cent he will not answer it, as it should be answered. He would evade it. "Think of it yourself," would be the answer. "I do not wish that people should give specific meanings to my verses because that

THE OASIS

BAHAWALPUR, APRIL, 1941.

Iqbal's Philosophy of Life

CHAPTER I

Preface

TO THE MONOGRAPH

I had no intention to write this monograph at the present moment. The credit or discredit of getting this written with its virtues or faults goes to our energetic editor of the English Section, Mr. Shahid. He requested me so many times and in such terms that I did not like to refuse him.

He knew about my study and connections with Iqbal. He knew that I had been connected with Iqbal for a long time in the literary sphere. I had chances of discussing with him the various points given by him in his works. I went to Persia for study and research. After that we became much more intimate because his vehicle of thought was Persian. It was Iqbal, who invited the attention of the Panjab University and Muslim savants towards the idea that research work should be done in the field of Muslim sciences. This field was still virgin and the contribution of the Muslims in sciences was unknown to the world. I took it up. Originally I was an M.Sc. Having been inspired in certain ways in the company of Iqbal, I continued to put in hard efforts for the systematic study of Persian and Arabic. I passed my M.A. in Persian, and another M.A. in Arabic. After that I requested Iqbal to help me in finding a suitable subject for research work in Muslim sciences; and he did so. As he believed it was originally his idea, he felt much interested in my research work. We often sat together for long periods discussing various points in the thesis. This gave me a chance of being in his company

We take pride in publishing with this article an unpublished and unique photograph of Dr. Iqbal. In this photograph you find Dr. Iqbal and the author of this article discussing the poetry of Iqbal. The book, Piam-i-Mashriq, is in the hands of Dr. Shuja. We also take pride in publishing an unpublished letter of Dr. Iqbal written to Professor Shuja.

We have been fortunate enough to prevail upon Dr. Shuja to yield his treasures to which request he would not have agreed if made by other persons. We hope the article, which is an original contribution to Iqbalian literature, will be appreciated by our readers.

P. A. RASHID
Director, English Section.

FOREWORD

This long article on Iqbal's philosophy of life has been written by our talented Professor, Dr. F. M. Shuja. It is an original contribution to Iqbalian literature, and we are justly proud to publish it. It is a credit to the OASIS to secure articles of such outstanding merit and high literary quality.

Being a scholar of Arabic and Persian, and having travelled in the Arabic and Persian speaking areas, Dr. Shuja is qualified to fully understand the language of the great 'Poet of the East.' Being a student of Islamic literature he is in a position to understand the numerous references to Muslim history and Muslim literature which occur in Iqbal. Throughout his writings Iqbal has made a full use of these references. His poetry is saturated with the incidents and facts of Muslim history. To understand and enjoy Iqbal, we must have a thorough knowledge not only of Persian and Arabic but also of Muslim history, culture, and literature.

Dr. Shuja is competent to write on Iqbal because of these qualifications and because he had intimate literary connections with the poet. We have many a time heard from him lectures and speeches on various aspects of Iqbal, and now he has written out for us one phase of the mental activities of the great philosopher. You will find at places in this article the sweatness of personal contact, and the confidence of direct touch with the great poet.

EDITORIAL BOARD

TABLE OF CONTENTS

EDITORIAL BOARD

TABLE OF CONTENTS